ماہنامہ
جنوری 2025ء
طلوعِ اسلام
لاہور
اشاعت کا اکیاسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)
حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

طلوعِ اسلام نے آج تک کوئی تنقید ایسی نہیں کی کہ جس کی تصحیح کا پہلو بھی وہ سامنے نہ لے آیا ہو۔ اس نے کبھی کوئی منفیانہ گوشہ ایسا نہیں پیش کیا جس کا مثبت گوشہ بھی ساتھ ہی اجاگر نہ کر دیا ہو۔ وہ جانتا ہے کہ خلاء فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے جب وہ کسی غلط چیز کو ہٹانے کی دعوت دیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اس کی جگہ کونسی صحیح چیز رکھنی چاہیئے۔ لہٰذا طلوعِ اسلام جب کبھی لا الہ کہتا ہے تو اس کے ساتھ ہی الا اللہ بھی پکارتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثرانداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرز خیال وعمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
جنوری 2025ء

جلد 78 شمارہ نمبر 01

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات	ادارہ	4
قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے یا نہیں؟	شمس العلماء (مولانا) الطاف حسین حالی	11
ص ل و (ی)	لغات القرآن	25
ہمیں کیسا پاکستان چاہئے!	محمد طاہر بٹ (سیالکوٹ)	34
انسانم آرزوست	وسیم احمد یزدانی (ایبٹ آباد)	39
انشاءاللہ	جمیل احمد عدیل	44
زندگی کا لنگر	عبدالرب	54
مسجدِ اقصیٰ	علامہ عنایت اللہ اثری	56
محمد عمر صاحب کی وفات پر تعزیتی پیغامات	ادارہ	59
اقبال کا شاہین ہو کہ پرویز کا سلیم	نفیسہ فریاد چاہل	63

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور
اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

طلوع اسلام کے ایک بہی خواہ رقم طراز ہیں:

طلوع اسلام کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کی مقبولیت کم ہوتی جارہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں حال کی خرابیوں پر تنقید تو ہوتی ہے لیکن کوئی متبادل اسکیم سامنے نہیں رکھی جاتی۔ طلوع سلام ہمارا محبوب ترین مجلہ ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ اس کی مقبولیت میں فرق آئے۔ لہٰذا آپ اس طرف ضرور توجہ دیں۔

چونکہ اس خط میں طلوع اسلام کے مسلک یا لائحہ عمل کے متعلق ایک اصولی چیز کو سامنے لایا گیا ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کا جواب نجی طور پر دینے کے بجائے' اسے طلوع اسلام کے صفحات ہی پر پیش کیا جائے تاکہ قارئین طلوع اسلام اس باب میں ہمارے موقف سے مطلع ہو جائیں۔

طلوع اسلام کے متعلق اکثر احباب کی طرف سے یہ شکایت یا مشورہ موصول ہوتا ہے کہ طلوع اسلام کوئی عملی کام نہیں کر رہا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے کہا یہ جاتا ہے کہ طلوع اسلام کو ایک جماعت بنانی چاہئے جو ملک کی سیاسی سرگرمیوں میں عملاً حصہ لے اور جس مقصد کی طرف طلوع اسلام دعوت دیتا چلا آ رہا ہے اسے عملی طور پر قوم کے سامنے پیش کرے۔ اس باب میں ہم اشارۃً اس سے پیشتر بھی کئی مرتبہ اپنا مقصد واضح کر چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آج کی نشست میں اس کی مزید وضاحت کر دی جائے۔

ہماری ناکامیوں اور تباہ حالیوں کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم بڑے جذباتی ہو چکے ہیں' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم حقائق کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں اور کوئی ایسا کام جس میں جذباتی تلاطم خیزیاں اور شور انگیزیاں نہ ہوں ہماری فطرت سیماب آسا کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ ہم ایک مدت کی جذبات پرستی سے اس کے خوگر ہو چکے ہیں کہ ایک ہنگامہ ہو' ایک جوش ہو' ایک خروش ہو' لچھے دار تقریریں ہوں' فلک بوس نعرے ہوں' سیل انگیز جلوس ہوں' بڑی بڑی انقلاب در آغوش اسکیمیں بنائی جائیں' آسمان الٹ دینے والے منشور شائع کئے جائیں' تہلکہ مچا دینے والے عزائم و مقاصد کا اعلان کیا جائے' اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو فریق مخالف کو گالیاں دے کر جیل خانہ ہو آئیں۔ بس اس کے بعد آپ کے باعمل ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں۔ یہی معراجِ مقاصد ہے۔ یہی منتہائے جہاد ہے اور یہ سب کچھ ایک پارٹی بنا کر کیا جائے۔ جماعت سازی اور گروہ بندی کے بغیر آپ باعمل ہونے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے۔ زندگی کی حرارت کا مقیاس ہی پارٹی بازی ہے۔

یہ ہے ''عمل'' کا وہ تصور جو ایک عرصہ سے قوم کے ذہن میں مرتسم کیا جا رہا ہے اور جس کے ذریعے قوم کے جذبات سے

بری طرح کھیلا جا رہا ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ آپ کی گذشتہ تاریخِ سیاست میں کیسے کیسے دلفریب نعرے (Slogans) تھے جن سے قوم کے جذبات کو مشتعل کر کے اسے آگ کے شعلوں میں جھونک اور خون کی ندیوں میں دھکیل دیا گیا۔ ذرا غور کیجئے کہ اس دوران میں آپ کی قوم نے کس قدر جانی اور مالی قربانیاں دیں اور وہ تمام قربانیاں کس بری طرح سے رائیگاں گئیں۔ کتنے افراد ہیں جوان بے نتیجہ قربانیوں کے ہاتھوں در بدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کتنے خاندان ہیں جوان جذباتی شعلہ فشانیوں کے بے معنی ہنگاموں سے تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ کتنے بچے ہیں جن کی نگہ پرداخت کرنے والے ان تلاطم انگیز بے مقصد تحریکوں کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے اور ان کا آج کوئی والی اور وارث نہیں۔ کتنے گھر ہیں جن کے چراغ انہی جھکڑوں نے بجھا دیئے اور کتنے در ہیں جنہیں یہی آندھیاں اکھیڑ کر لے گئیں اور ان تمام بربادیوں اور تباہیوں کا ماحصل؟ فضا میں چند الفاظ سے پیدا کردہ وقتی ارتعاش اور سینوں میں چند نعروں سے ابھارا ہوا عارضی تموج۔ سوچئے کہ آپ کی بے شمار تحریکوں اور لاتعداد جماعتوں کے ''جہادِ زندگی'' کا مابقا اس کے سوا کچھ اور بھی ہے؟ یہ تو یوں کہئے کہ قدرت کو ان چند کروڑ مسلمانوں کو بچانا مقصود تھا جو بساطِ سیاست کی آخری مہرہ بازی جناحؒ جیسے ٹھنڈے دماغ کے ہاتھ لگ گئی جس نے اس مردِ آخر بیں کے فکر صحیحہ کو یوں متشکل کر دکھایا جس کی مغفرت کے لئے عالمگیر کی مسجد جامع کے مینار شب و روز دست بدعا ہیں۔ ورنہ ہماری ہنگامہ خیز محفلوں کی یادگار آج سوائے خاکسترِ پروانہ کے اور کچھ بھی نہ ہوتی۔

طلوع اسلام کو فطرت کی کرم گستری نے یہ سمجھنے کی توفیق ارزانی فرما دی کہ قوموں کے حالات ہنگامہ خیزیوں اور تموج انگیزیوں سے نہیں بدلا کرتے۔ ان کی حالت میں کوئی تبدیلی مستقل طور پر پیدا نہیں ہو سکتی جب تک ان کے قلب و نگاہ میں تبدیلی نہ پیدا ہو، خارجی دنیا میں کوئی انقلاب رونما نہیں ہو سکتا جب تک انسان کی داخلی دنیا میں انقلاب واقعہ نہ ہو جائے، کسی قوم کا معاشرتی نظام صحیح خطوط پر متشکل نہیں ہو سکتا جب تک اس میں تطہیر فکر و نظر نہ ہو جائے، انسان ویسا ہی کرتا ہے جیسا سوچتا ہے۔ لہٰذا جب تک اس کی سوچ کی بنیادیں صحیح نہ ہوں اس کا کردار صحیح قالب میں نہیں ڈھل سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس کے سامنے بے نقاب ہو گئی کہ فکر و نظر میں تبدیلی پیدا کرنے کی راہ بڑی صبر آزما اور ہمت شکن ہے۔ اس لئے کہ اس راہ میں بڑی آہستہ خرامی اور نرم روی کی ضرورت ہے۔ اس میں سطح کی تلاطم انگیزیاں نہیں بلکہ عمیق دریا کی غیر محسوس روانیاں ہیں۔ پھر اس راہ میں سب سے بڑی دشواری یہ ہوتی ہے کہ جذبات پرست قوم پیش پا افتادہ مفاد کی طرف لپکنے کی خوگر ہوتی ہے اور قلب و نظر کی تبدیلی کے آثار کئی نسلوں کے بعد جا کر سامنے آیا کرتے ہیں۔ یعنی، غالب کے الفاظ میں، عجلت پسند قوم کی تمنائے حصولِ مقاصد بے تاب، اور دل کی دنیا کا عشق آسا انقلاب، صبر طلب ہوتا ہے۔ اس لئے ہنگاموں کی عادی قوم فکر و نظر کی تبدیلی کی جدوجہد کو ''عمل'' میں شمار ہی نہیں کرتی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے متعلق، شورش انگیز، ہنگامہ پرور ''راہنمایانِ ملت'' یہ الزام عائد کیا کرتے تھے کہ ''اقبالؔ ایک بے عمل شاعر ہے''۔ ان کے نزدیک عمل سے مفہوم انہی جیسی ہنگامہ آرائیاں تھیں۔ یہی لوگ قائداعظم علیہ الرحمۃ کے متعلق بھی یہی طعن دیا کرتے تھے کہ وہ عملی انسان نہیں۔ اور عمل

سے ان کی مراد ہوتی تھی جیل خانہ کی یاترا کرنا۔ لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ ''سراپا عمل''، فصلی طیور، اپنی اپنی بولیاں سنا کر اڑ گئے اور باقی رہنے والے نتائج، انہی ''بے عمل'' انسانوں کے فکر و مساعی سے پیدا ہوئے۔

طلوع اسلام نے اپنے لئے قلب و نگاہ کی تبدیلی کی اسی دشوار گذار راہ کو تجویز و اختیار کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ راہ کتنی لمبی اور اس کا سفر کس قدر حوصلہ آزما ہے۔ پیش پا افتادہ مفاد کی ایمان شکن جاذبیتیں بھی اس کے سامنے ہیں اور قدم قدم پر اسے دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ وہ ان مفادات کے سہل الحصول طریقوں کو بھی جانتا ہے اور ان کے غصب و نہب کی راہوں سے بھی واقف ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے لئے وہی طریق تجویز کیا ہے جس میں نہ کوئی عاجلانہ لذت ہے نہ نگاہ فریب کشش۔ نہ فوراً مشتعل ہو جانے والے جذبات کی جھوٹی تسکین کا سامان ہے نہ راتوں رات انقلاب برپا کر دینے والی طفلانہ آرزوؤں کی فریب دہی کا کوئی نسخہ۔ اس کی راہ، ستاروں کی سی خاموش روانیوں کی کہکشاں ہے جو رات کی پرسکوت و مہیب تنہائیوں میں بے بانگ رحیل و بے جرسِ کارواں، چپکے ہی چپکے طول و طویل منازل طے کرتی جاتی ہے، هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝ وہ اپنے قارئین کی اس بے تابیٔ تمنا سے بھی خوب واقف ہے جو ایک طرف اس پر یقین رکھتے ہیں کہ طلوع اسلام کی دعوت، حق و صداقت کی دعوت ہے اور دوسری طرف یہ دیکھتے ہیں کہ مسانید اثر و اقتدار پر وہ گروہ اور جماعتیں متمکن ہوئی جاتی ہیں جن کے پاس جذبات انگیزی کے سوا اور کچھ نہیں تو اس سے ان کے دل میں ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے جو بعض اوقات ان خطوط کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جس کے اقتباس سے لمعات پیش نظر کی ابتدا ہوئی ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ جب یہ کہتے ہیں کہ طلوع اسلام کوئی متبادل اسکیم نہیں پیش کرتا تو ان کی اس سے مراد کیا ہوتی ہے! طلوع اسلام نے آج تک کوئی تنقید ایسی نہیں کی کہ جس کی تصحیح کا پہلو بھی وہ سامنے نہ لے آیا ہو۔ اس نے کبھی کوئی منفیانہ گوشہ ایسا نہیں پیش کیا جس کا مثبت گوشہ بھی ساتھ ہی اجاگر نہ کر دیا ہو۔ وہ جانتا ہے کہ خلاء فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے جب وہ کسی غلط چیز کو ہٹانے کی دعوت دیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اس کی جگہ کونسی صحیح چیز رکھنی چاہئے۔ لہٰذا طلوع اسلام جب کبھی لا الہ کہتا ہے تو اس کے ساتھ ہی الا اللہ بھی پکارتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ

لا والا ساز و برگِ اُمتاں
نفیٔ بے اثبات مرگِ اُمتاں

اس لئے وہ تخریب بلا تعمیر کا نقشہ کس طرح سامنے رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا طلوعِ اسلام کے جو بہی خواہ یہ شکایت کرتے ہیں کہ وہ تنقید کے ساتھ متبادل اسکیم نہیں پیش کرتا تو متبادل اسکیم سے ان کی مراد ایسی اسکیم ہوتی ہے جو زمامِ اقتدار و اختیار کو غلط ہاتھوں سے فوراً چھین لے۔ اگر متبادل اسکیم سے ان کی یہی مراد ہے تو وہ معاف رکھیں! طلوع اسلام ایسی متبادل اسکیم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کو تو وہ پیش پا افتادہ مفاد کی چھین جھپٹ قرار دیتا ہے جس نے قوم کو اس درجہ سطحی جذبات کا پیکر اور ہماری تمام تحریکات کو بے نتیجہ بنا رکھا ہے۔ طلوع اسلام ایسی ''متبادل اسکیم'' دیتا ہے جس سے قوم کی نگاہوں میں وہ تبدیلی پیدا ہو جائے کہ وہ زمامِ اقتدار و

اختیار کسی غلط ہاتھ میں جانے ہی نہ دے۔ طلوع اسلام سے ایسی محکم اسکیم کی تمنا رکھئے، ویسی عاجلانہ اسکیم کی نہیں۔

قلندر ریم و کراماتِ ما جہاں بینی ست
زما نگاہ طلب، کیمیا چہ می جوئی؟

اور یہی وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام نے آج تک کوئی جماعت نہیں بنائی حالانکہ اس کے لئے احباب کی ''بیتابیٔ تمنا'' بار بار اصرار کر رہی ہے لیکن وہ اس طریقِ جماعت سازی کے بھی خلاف ہے اور اسے محض عاجلانہ مفاد پرستی کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ یہ جماعتیں کس طرح بنتی ہیں؟ کچھ لوگ اکٹھے ہو کر ایک پارٹی کا اعلان کرتے ہیں اور اس کے اغراض و مقاصد کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ دوسروں کے ہاں سے فریب خوردہ افراد اس نئی آواز میں پناہ ڈھونڈتے اور جماعت اول سے اپنی فریب خوردگی کے انتقام کا سامان مضمر سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ان کی دعوت پر لبیک کہہ دیتے ہیں۔ یوں یہ جماعت وجود میں آ جاتی ہے۔ اس کے بعد جماعتی عصبیت سے ان افراد میں سیمنٹ کا کام لیا جاتا ہے، یعنی ان کے دل میں اپنی جماعت کے برسرِ حق ہونے اور دوسری جماعتوں کے باطل پر اکٹھا ہونے کا ایمان کوٹ کوٹ کر بھرا جاتا ہے۔ یہی ہے وہ جماعتی عصبیت جسے قرآن کل حزب بما لدیھم فرحون کی عمیق نفسیاتی کیفیت سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی ہر جماعت اس عقیدہ میں مگن ہوتی ہے کہ وہی برسرِ حق ہے۔ اس طرح باہمی نفرت سے قوم ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے۔ یہی وہ فرقہ پرستی اور جماعت سازی ہے جسے قرآن کھلے لفظوں میں شرک وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ (30:32-31)۔ مسلمانو! دیکھنا کہیں (اسلام لانے کے بعد پھر سے) مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں پارٹیاں (فرقے) بنا لیں اور پھر خود بھی ایک پارٹی بن گئے اور ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ ہر پارٹی مگن ہو کر بیٹھ گئی کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔) قرار دیتا ہے اور خدا کا عذاب کہہ کر پکارتا ہے۔ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ (6:65) کہو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے۔ یا تمہیں پارٹیوں میں بانٹ دے اور اس طرح تم ایک دوسرے سے لڑائی کا مزہ چکھو۔) پہلے زمانہ میں یہی گروہ بندی مذہبی فرقوں کے نام سے متعارف ہوتی تھی۔ اس دورِ سیاست میں یہ فرقہ بندی سیاسی جماعتوں کے پیرہن میں پائے کوب ہوتی ہے۔ روح وہی پرانی ہے، فقط نقاب نئے ہیں۔

کہا جائے گا کہ خود خدا بھی مسلمانوں کو حزب اللہ (خدا کی جماعت) قرار دیتا ہے۔ اس لئے ہر جماعت شرک کا مظہر اور عذابِ خداوندی کا پیکر نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ کہتے وقت اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ خدا ملتِ اسلامیہ کو، غیر مسلموں کے مقابلہ میں حزب اللہ کہتا ہے اور دوسروں کو حزب الشیطان۔ یعنی حزب اللہ، پوری کی پوری ملت ہے نہ کہ ملت کے اندر ایک گروہ۔

پھر یہ کہا جائے گا کہ آج جس حالت میں مسلمان ہے جب انہیں اس حالت سے نکال کر صحیح اسلامی حالت تک لے جایا جائے گا تو اس کے لئے بہر حال کسی نہ کسی جماعت کی ضرورت ہو گی۔ جماعتی رنگ کے بغیر آپ کام کیسے کریں گے؟ سو پہلے تو

یہ دیکھ لیجئے کہ قرآن نے جب فرقہ بندی اور پارٹی بازی کو شرک اور عذابِ خداوندی قرار دیا ہے تو اس میں ایسے حالات میں بھی کسی استثنیٰ کا ذکر نہیں۔ اس کے بعد پھر وہی چیز سامنے آئے گی کہ مسلمانوں کی اصلاح کا کام کیسے کیا جائے؟ تو سوال یہ ہے کہ کیا جماعت سازی کے بغیر اصلاح کے کام کی کوئی شکل نہیں نکل سکتی؟ کیا طلوع اسلام نے اپنی ہندوستان کی چار سالہ زندگی اور پھر اس کے بعد پاکستان کی سائۃِ ثانیہ میں جماعت سازی کے بغیر کوئی کام نہیں کیا؟ ضرورت ہے صرف کام کرنے والوں کی۔ یہ رفقائے کار اپنے اندر، تقسیم عمل کے طریق پر، نظم وضبط پیدا کریں گے اور ایک طے کردہ پروگرام کے ماتحت کام کرنا شروع کر دیں گے۔ ان کی دعوت یہ نہیں ہوگی کہ ہماری ''جماعت'' میں شامل ہو جاؤ۔ یہ اپنے آپ کو کسی پارٹی کے ساتھ منسوب کئے بغیر، مسلمانوں کے فکر ونظر میں تبدیلی کی کوشش کریں گے۔ یہ انہیں مذہب کے غلط تصور کی بجائے، دین کا صحیح تصور دیں گے۔ ان کی حیثیت معلمین کی ہوگی نہ کہ کسی پارٹی کے داعیان کی۔ اس وقت بھی حلقہ طلوع اسلام میں ایسے لوگ موجود ہیں جو طلوع اسلام کی پیش کردہ تعلیم کو اپنے اپنے دائرہ عمل واثر میں نہایت خاموشی سے پھیلاتے رہتے ہیں اور، دوسرے تو ایک طرف، خود ادارۂ طلوع اسلام کو بھی ان کی اس تبلیغ وتنشیر کا علم نہیں ہوتا، وہ کسی جماعت کے رکن نہیں، کسی پارٹی کے ممبر نہیں۔ لیکن اس کے باوجود، وہ اپنے دائرہ میں رجعت الی القرآن کی اس دعوت کو عام کرتے رہتے ہیں جس کا نقیب طلوع اسلام ہے۔ طلوع اسلام کو اپنے ان خاموش، گمنام اور غیر متعارف، مبلغین پر ناز ہے کہ اس کا مقصود اس قسم کے لوگ پیدا کرنا ہے جو ہنگامہ آرائیوں سے الگ ہٹ کر چپکے ہی چپکے دوسروں کے قلب ونگاہ میں وہی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کریں جو ان کی نگاہ میں پیدا ہو چکی ہے۔ انہی غیر متعارف مبلغین میں سے اکثر ادارۂ طلوع اسلام کے ساتھ اپنا ربط قائم رکھتے ہیں۔ وہ ادارہ سے ان مشکلات کا حل دریافت کرتے ہیں جو انہیں اپنی اس تبلیغ کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ وہ ان استفسارات کا جواب پوچھتے ہیں جو ان سے دوران تبلیغ میں کئے جاتے ہیں اور جن کے جواب میں انہیں دقت پیش آتی ہے۔ وہ اپنے مشوروں سے ادارہ کو مستفید کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح قرآن کے طالب علموں کا یہ ایک خاموش سا حلقہ دن بدن وسیع ہوتا چلا جارہا ہے۔ اس حلقہ کا کوئی نام نہیں، یہ کسی پارٹی کے ممبر نہیں۔ ان کے سامنے کوئی پیش پا افتادہ مفاد نہیں۔ یہ اپنی کوششوں کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان رکھتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ وہ جس ذہنی اور قلبی انقلاب کے لئے کوشاں ہیں اس کے سوا ملت کے مرضِ کہن کا کچھ اور چارہ نہیں۔ اس وقت اس انقلاب کے کوئی محسوس اور نمایاں آثار ان کے سامنے نہیں اور ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی پوری عمر اس جدوجہد میں صرف کر دیں اور یہ انقلاب محسوس صورت میں ان کے سامنے نتیجہ خیز نہ ہو۔ لیکن وہ اس کے باوجود نہایت استقلال واستقامت سے اپنی کوششوں میں منہمک ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی بنیادی تبدیلیاں ایک دن میں رونما نہیں ہو جایا کرتیں۔ یہ وہ تبدیلیاں ہیں جن کے متعلق اورتو اور خود ذات رسالتمآب ﷺ سے کہہ دیا گیا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ ان کے محسوس نتائج حضور ﷺ کے بعد ظہور پذیر ہوں۔ اس لئے کہ اس جدوجہد میں کسی ایک فرد یا افراد کی اپنی زندگی کا سوال ہی نہیں۔ سوال تو پوری کی پوری قوم میں انقلاب پیدا کرنے کا ہے اور اس کے بعد، تمام نوعِ انسانی میں

انقلاب پیدا کرنے کا۔ یہ ایک نسل کی جدوجہد میں پیدا ہو جائے یا اس کے لئے دس نسلوں کی مسلسل جدوجہد کی ضرورت پیش آئے۔ مدت کا اس میں کوئی سوال نہیں۔ اگر اسی قسم کے انقلاب کی کوشش سو سال پہلے شروع ہوتی تو آج جو کچھ ہم دیکھنا چاہتے ہیں ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتا۔ اگر یہ کوشش اس سے پہلے شروع نہیں ہوئی تو اسے آج شروع کر دینا چاہئے تاکہ آج نہیں، تو کل، کسی نہ کسی وقت یہ انقلاب ظہور پذیر ہو جائے۔ لیکن اگر آپ مدت کی طوالت سے گھبرا کر، پھر عاجلانہ طریقِ کار کی طرف لپک پڑے تو یہ انقلاب پھر ویسے کا ویسا رہ جائے گا۔ یہ عاجلانہ طریق کار، سر درد کے لئے اسپرین کی ٹکیہ ہے۔ سر درد ایک منٹ میں غائب ہو جائے گا لیکن جب اسپرین کا اثر زائل ہوگا تو پھر پہلے سے بھی دگنی شدت کے ساتھ ابھرے گا اور اگر آپ اسے ہر بار اسی طرح اسپرین کے عاجلانہ علاج سے دباتے رہے تو ممکن ہے ایک دن آپ کو درد کی جگہ سر سے ہی جواب مل جائے۔ مسلمان جذبات پرستی کی اسپرین سے علاج کا خوگر ہو رہا ہے، یہ عاجلانہ فائدہ چاہتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ ایک منٹ میں سر درد غائب ہو جائے۔ لیکن ایک طبیب حاذق کی نگاہ عاجلانہ فائدہ پر نہیں بلکہ مزمن مرض کی علت کی اصلاح پر ہوتی ہے اور وہ اصلاح وقت بھی چاہتی ہے اور علاج میں استقامت بھی۔ اس میں ایک سر درد کے علاوہ اور دردسری بھی برداشت کرنی پڑے گی۔ لیکن جب آرام آئے گا تو ہمیشہ کے لئے مرض جاتا رہے گا۔ طلوع اسلام، اسپرین کی ٹکیہ نہیں دیتا۔ یہ اسی حاذقانہ انداز سے علاج کرنا چاہتا ہے جس طریق سے اس سے پہلے ایک مرتبہ علاج ہو چکا ہے اور اس علاج کے نتائج دنیا دیکھ چکی ہے۔

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی!

یہ ہے طلوع اسلام کا مقصود و منتہیٰ اور یہ ہے اس مقصد کے حصول کے لئے اس کا طریق کار۔ جو اس طریق کار کی افادیت اور خیریت انجام پر یقین رکھتا ہے وہ اس کا ساتھ دے۔ لیکن جو اسی جدوجہد کا کامیاب تصور کرے جس میں عاجلانہ مفاد کو سمیٹا جا سکے، اسے کوئی اور ساتھی تلاش کرنا چاہئے کہ اس کے لئے اس طریق کار میں محنت و مشقت کے سوا کچھ نہیں۔ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (2:200) ''جو شخص محض پیش پا افتادہ قریبی مفاد چاہتا ہے (اسے وہ مفاد تو مل جاتے ہیں۔ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ (3:145)) لیکن اس کا مستقبل کے مفاد میں کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔'' اب یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ ان دونوں راہوں میں سے جونسی راہ پسند کریں اپنے لئے تجویز کر لیں۔ طلوع اسلام اپنے لئے ایک راہ تجویز کر چکا ہے اور اسے اس راہ کے صراط مستقیم ہونے پر یقین ہے۔

کہہ دیا جائے گا کہ آپ قلب و نگاہ کی تبدیلی کی فکر کرتے رہئے اور اتنے میں بے زمام قوتیں ایسا استحکام حاصل کر جائیں گی کہ پھر ان کے پاؤں اکھیڑنا ممکن نہیں رہے گا۔ لیکن یہ کہنے والے بھول جاتے ہیں کہ نہ ہم جناب صاحب ضرب کلیمؑ اور حضور نبی اکرم ﷺ سے بڑھ کر داعیٔ انقلاب ہیں اور نہ ہی یہ سرکش قوتیں، فرعون اور ابوجہل سے زیادہ محکم گیر ہیں۔ حضرت موسیٰؑ چالیس برس تک قوم کے قلب و نگاہ کی صحیح تربیت میں مصروف تگ و تاز رہے اور بنی اسرائیل ارض موعود پر ان کی وفات

کے بعد قدم رکھ سکے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کامل تیرہ برس تک نہایت سکون و استقامت سے اپنے پیغام کی خاموش تبلیغ میں منہمک رہے اور اس دوران میں سرکش قویٰ کی طرف سے آپ صعوبات کو بڑی ہمت اور استقلال سے برداشت کرتے رہے۔ جب انہیں بھی بیج سے کھیتی پکنے تک کا عرصہ انتظار میں گذارنا پڑا تو ہم کس طرح دانہ بوتے ہی فصل کاٹ سکتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراضات اس بیتابیٔ تمنا یا مفاد عاجلہ کے مظاہر ہیں جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ پھر اسے بھی سمجھ رکھئے کہ جمہور کی نگاہ کی تبدیلی سے اتنا بڑا تند و تیز سیلاب اٹھا کرتا ہے کہ بڑی سے بڑی زمین گیر قوتیں اس کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ جایا کرتی ہیں۔ سرکش قوتوں کی یہ محکمیت اسی وقت تک عمیق و شدید دکھائی دیتی ہے جب تک ہم میں ناپختگی ہے۔ داعیانِ انقلاب کے قلب و نگاہ کی پختگی اور محکمی کے آگے یہ قوتیں پرکاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ لہٰذا صحیح راہِ عمل یہی ہے کہ نہایت استقامت اور سکون سے قلب و نگاہ کی تبدیلی کے لئے سعیٔ پیہم میں مصروف رہئے اور جب یہ تبدیلی پختگی تک پہنچ جائے تو باطل کی قوتوں کو ایک ہی جھٹکے سے الگ کر دیجئے۔

بانشۂ درویشی، در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

ترجمہ: ''درویشی'' کے نشہ کے ساتھ موافقت پیدا کر اور ہر دم (اپنے مقصد کے حصول کو سامنے رکھ کر) لگا رہ۔ جب پختہ ہو جائے تو اپنے آپ کو جم کی سلطنت کے ساتھ ٹکرا دے۔

یہ ہے طلوع اسلام کا مقصد و طریق کار۔ اگر آپ میں اس سے زیادہ کام کرنے کی ہمت ہے تو ایک قدم اور آگے بڑھئے اور وہ قدم یہ ہے کہ تمام کام چھوڑ کر ملک کے طول و عرض میں درسگاہوں کا ایک ایسا سلسلہ قائم کیجئے جن میں ابتدا سے انتہا تک اس نہج کی تعلیم دی جائے جس کی تبلیغ طلوع اسلام کے صفحات پر ہوتی ہے، یعنی خالص قرآن کی روشنی میں تمام علومِ جدیدہ کی تعلیم۔ اگر آپ نے یہ کر دیا تو تبدیلیٔ قلب و نگاہ کا وہ عرصہ جس کی درازی آپ کو شبِ ہجر کی طرح ڈرا رہی ہے، سمٹ کر بیس پچیس سال میں ختم ہو جائے گا۔ جونہی آپ کے بچوں کا پہلا گروہ ان درسگاہوں سے فارغ ہو کر نکلا، ساری زمین پر چلتا پھرتا انقلاب نظر آ جائے گا۔ اس کے بعد دیکھئے کہ اس خطۂ ارض کی تقدیر کس طرح سے بدل جاتی ہے۔ اگر قوم میں سرسید مرحوم کی سی ہمت والے لوگ موجود ہیں تو وہ کسی ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور سارے ملک میں اس قسم کی آزاد درسگاہوں کا جال بچھا دیں۔ اگر آپ نے ہمت کر کے اس خطۂ زمین کو بیس پچیس سال تک اغیار کی نظرِ بد سے بچا لیا اور ادھر درسگاہوں سے وہ شاہیں بچے نئے بال و پر لے کر نکل آئے تو پھر آپ آسمان سے سینہ تان کر کہہ سکیں گے کہ

دیدہ آغازم! انجامم نگر!!

ترجمہ: تو نے ابھی میرا آغاز دیکھا ہے۔ میرا انجام بھی دیکھنا۔

اور اگر آپ یہ نہیں کرنا چاہتے تو پھر ان مقدس مداریوں کے ہاتھوں میں کھیلتے رہئے جو اپنے جھولے میں سب کچھ رکھنے کے دعویدار بھی ہیں اور رات کی روٹی کے لئے آپ کی بھیک کے محتاج بھی۔

شمس العلماء (مولانا) الطاف حسین حالی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے یا نہیں؟

آج چاروں طرف سے یہ شور سنائی دے رہا ہے کہ پرویز صاحب قرآن کریم کے بعض الفاظ اور آیات کی جو تشریح و تفسیر بیان کرتے ہیں، وہ تفسیر متقدمین کے ہاں نہیں ملتی، اس لئے وہ رد کر دینے کے قابل ہے اور پرویز صاحب کا یہ طرزِ عمل دین میں فتنہ (اور نہ جانے کیا کیا) ہے۔ ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے یہ اعتراض نیا نہیں۔ ہماری پوری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ مسلمانوں میں جب بھی کسی صاحبِ علم و بصیرت نے اپنے غور و فکر سے کوئی ایسی بات کہی جو اسلاف کے ہاں نہیں ملتی تھی، اسے ملحد و زندیق قرار دے دیا گیا اس لئے کہ ان قدامت پرستوں کے نزدیک ندرتِ فکر و خیال بدعت ہے اور ہر بدعت جہنم میں لے جاتی ہے۔

جب اسی قسم کے اعتراضات سرسید کے زمانے میں اٹھائے گئے تو حالی مرحوم نے ان کے جواب میں ایک مفصل مضمون لکھا جو رسالہ معارف علی گڑھ کی دسمبر 1899ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ ہم اس مقالہ کو (غیر متعلقہ نظائر و حواشی کے حک کے بعد) درج ذیل کرتے ہیں۔

سرسید کے متعلق اس مقام پر اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج ہمیں، پاکستان کی شکل میں جو خطۂ زمین میسر ہے اور جس میں ہمارے اربابِ شریعت، اقامتِ دین اور نظامِ شریعت کی تنفیذ و ترویج کے خواہاں ہیں، یہ اسی مردِ حق آگاہ و حقیقت شناس کی دور نگہی کا تصدق ہے۔ اگر اس وقت سرسید اتنی ہمت اور جرأت سے کام نہ لیتا (اور مولوی صاحبان کی اچھالی ہوئی کیچڑ سے مرعوب ہو جاتا) تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد ہندوستان میں بالکل اسپین کا نقشہ دکھائی دیتا۔

جہاں تک سرسید کی تفسیر کا تعلق ہے اس کے بیشتر مقامات سے ہمیں اختلاف ہے لیکن جس اصول کے ماتحت اس نے

تفسیر جدید کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ اس سے ہمیں پورا پورا اتفاق ہے۔ علاوہ ازیں، سرسید نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ غلطی سے مبریٰ اور وحی کی طرح واجب التسلیم ہے۔ اس کے برعکس، اس نے اپنے ایک لیکچر میں (جو ''اسلام'' کے عنوان سے لاہور میں دیا گیا تھا) اس کا اقرار کیا ہے کہ

میں معصوم نہیں اور نہ معصوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ میں ایک جاہل آدمی ہوں۔ اسلام کی محبت سے میں نے یہ کام کیا ہے جس کے میں لائق نہیں ہوں۔ ممکن ہے کہ اس میں غلطی ہو مگر آئندہ علماء اس کی صحت کر دیں گے اور اسلام کو مدد دیں گے۔ میرے خیال میں مخالفین اور مشککین فی الاسلام کے مقابلہ میں اسلام کی تائید اسی طریقہ پر ہو سکتی ہے اور کسی طریقہ پر نہیں ہو سکتی۔

بعینہٖ یہی کچھ پرویز اپنے متعلق کہتا ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ

اس حقیقت کو میں معارف القرآن کی سابقہ مجلدات میں بار بار پیش کر چکا ہوں۔ اور پھر اس کا اعادہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنے فہم قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہو سکتا کہ وہ سہو و خطا سے منزہ ہے یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے وہ قرآن کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے وہ میرے ذہن کی نارسائی ہے۔

(معراج انسانیت، فاتحۃ الکتاب)

نیز یہ کہ جو کچھ ہم قرآن سے آج سمجھ سکتے ہیں، وہ لامحالہ ہمارے زمانے کی علمی سطح کے مطابق ہی ہو سکتا ہے جب زمانہ علمی اعتبار سے آگے بڑھ جائے گا تو اس کے لئے ہمارا فہم قرآن کافی نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی دور میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو کچھ قرآن کے متعلق اس وقت سمجھا جا رہا ہے وہ حرفِ آخر ہے۔ (سلیم کے نام، نیز دیگر مقامات)۔

باقی رہے صاحبِ مضمون (جناب حالیؔ) سو ان کے متعلق اس سے بہتر اور کیا کہا جائے گا جو اقبال کہہ گیا ہے

طوافِ مرقدِ حالی سزد ارباب معنی را
نوائے او بجا نہا شور افگندے کہ من دارم

یہ بھی عجیب مماثلت ہے کہ جس طرح ہمارا ملا اس حالی کو منکرِ حدیث اور منکرِ شانِ رسالت قرار دیتا ہے جس نے حضور سرورِ کائنات ﷺ کی شانِ اقدس میں وہ نعت کہی جس کا کوئی جواب نہیں۔ یعنی

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

(الخ)

اسی طرح آج اس پرویز کو (معاذ اللہ) منکرِ سنت کہا جاتا ہے جس نے سیرتِ طیبہ پر وہ کتاب (معراجِ

انسانیت) پیش کی ہے جس کی مثال (کم ازکم) اردو لٹریچر میں کم ملے گی۔

بہرحال، یہ ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ اب آپ حالی کا مقالہ ملاحظہ فرمائیے۔ (طلوع اسلام)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اعتراض: سرسید کی تفسیر جس میں بیسیوں آیات کے معانی جمہور مفسرین کے خلاف لکھے گئے ہیں اس کی نسبت پہلا شبہ جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ باوجود بیشمار تفسیروں کے جو گذشتہ تیرہ سو برس میں وقتاً بعد وقت قرآن مجید کی لکھی گئی ہیں اب تفسیر قرآن کے متعلق ایسا کونسا مرحلہ باقی رہ گیا ہے جس کو علمائے سلف نے طے نہ کر لیا ہو؟ اولاً رسولِ خدا ﷺ نے جن کے برابر قرآن کا علم کسی امتی کو نہیں ہوسکتا جن آیتوں کے معانی بیان کرنے کی ضرورت تھی خود زبانِ مبارک سے ان کا مطلب ارشاد فرما دیا۔ پھر آپ کے بعد صحابہؓ تابعین تبع تابعین اور علمائے امت نے جو یقیناً اس زمانے کے لوگوں سے بہتر قرآن کے معنی سمجھنے والے تھے۔ قرآن کی ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ کو بالکل حل کر دیا۔ پس زمانہ حال کے مفسر کے لئے اس کے سوا کوئی منصب باقی نہیں رہا کہ وہ انہی تفسیروں کا ماحصل جو علمائے سلف لکھ گئے ہیں زیادہ شرح و بسط یا زیادہ اختصار یا زیادہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دے۔ یا ایک زبان سے دوسری زبان میں ان کا ترجمہ کر دے۔ یہ منصب اب کسی کا نہیں ہے کہ ایک بھی آیت کے معنی ایسے بیان کرے جو تیرہ سو برس میں کسی نے نہ بیان کئے ہوں۔ چنانچہ اسی شبہ کی بنا پر بعض ستم ظریفوں کو کہتے سنا ہے کہ جو مطلب قرآن کا سرسید نے بیان کیا ہے وہ نہ خدا کو سوجھا نہ نبی کو نہ صحابہ و تابعین کو اور نہ دیگر علمائے امت کو۔

محکمات و متشابہات: اس مضمون میں ہم کو اسی شبہ کا حل کرنا مقصود ہے۔ مگر پہلے اس سے کہ اصل مقصود بیان کیا جائے چند باتیں ذہن نشین کر لینی ضروری ہیں ایک یہ کہ محکمات و متشابہات کے الفاظ جو قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں۔ ان سے کیا مراد ہے؟ شاہ ولی اللہ کے نزدیک جیسا کہ حجۃ اللہ البالغہ میں مذکور ہے۔

محکمات وہ آیتیں ہیں جن میں ایک معنی سے زیادہ کا احتمال نہ ہو۔

متشابہات: وہ ہیں جن میں متعدد معنوں کا احتمال ہو مگر مقصود ایک معنی سے زیادہ نہ ہو۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں جس قدر آیتیں ایسی ہیں جن میں معانی متعددہ کا احتمال ہوسکتا ہے وہ سب متشابہات کے تحت میں مندرج ہیں۔

دوسرے یہ کہ قرآن مجید میں متشابہات کے لانے سے شارع کا کیا مقصد تھا؟ امام رازی نے اس کی کئی وجہیں بیان کی ہیں۔ مگر سب سے عمدہ وجہ جس کو انہوں نے تمام وجوہ پر ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ ''قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں خواص و عوام سب کو حق کی طرف بلایا گیا ہے اور عوام کی طبیعتیں ادراکِ حقائق سے بعید ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر ان کے سامنے ایک ایسی ہستی کا بیان کیا جائے جو نہ جسم ہے نہ کسی مکان میں ہے اور نہ اس کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے تو ان کو یہی خیال ہوگا کہ ایسی چیز

معدوم محض کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ پس تقاضائے حکمت یہی تھا کہ ان کو ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا جائے جو من وجہ ان کے خیالات سے مناسبت رکھتے ہوں۔''

اندازِ تخاطب: شاہ صاحب نے اسی مطلب کو حجۃ اللہ البالغہ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ''شارع نے محض لوگوں کی معمولی سمجھ کے موافق جو دقایق علم وحکمت تک پہنچنے سے پہلے ان کی اصل خلقت میں ودیعت تھی ان سے خطاب کیا ہے اور اسی لئے (ان کی سمجھ کے موافق) فرمایا: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ (20:5)

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ''آنحضرت ﷺ نے ایک حبشیہ عورت سے پوچھا کہ ''خدا کہاں ہے؟'' اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ مومنہ ہے۔'' یعنی آنحضرت ﷺ نے باوجودیکہ آپ خدا تعالیٰ کو کسی خاص جہت میں ہونے سے منزہ جانتے تھے اس کے آسمان کی طرف اشارہ کرنے کو اس کے ایمان کے لئے کافی سمجھا اور اس دقیق بات کے سمجھانے کو مناسب نہ جانا کہ وہ ذات اقدس جہت اور مکان سے پاک ہے۔

ان سب حوالوں سے ظاہر ہے کہ قرآن میں وہ تمام روحانی اور اعلیٰ مقاصد جو عموماً انسان کی فہم وادراک سے اور خاص کر عرب کے امیوں کی سمجھ سے بالاتر تھے اور جن پر بالاجمال ایمان لانا کافی تھا اور ان کو مجاز واستعارہ اور تمثیل کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے تاکہ امی اور حکیم دونوں اپنی اپنی سمجھ کے موافق اس سے ہدایت حاصل کریں۔

عہد عتیق کی کتابیں جن کو مسلمان یہودی اور عیسائی سب آسمانی کتابیں مانتے ہیں چونکہ اس زمانے میں القا کی گئی تھیں جبکہ انسان کی سمجھ نہایت ابتدائی حالت میں تھی اس لئے ان میں قرآن سے کہیں زیادہ کلام کی بنیاد مجاز اور استعارے پر رکھی گئی ہے۔

اسی لئے شاہ ولی اللہ صاحبؒ انبیاء کے خواص کے ذکر میں لکھتے ہیں۔ ''ومن سیرتہم ان لا یکلموا الناس الا علیٰ قدر عقولھم التی خلقوا علیھا وعلو مھم التی ھی حاصلۃ عندھم باصل الخلقۃ۔''

متشابہات کی تاویل: تیسرے یہ بات بھی سمجھ لینی ضروری ہے کہ متشابہات کی تاویل جس کی نسبت قرآن مجید میں کہا گیا ہے وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ (3:7) اس سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس آیت کے یہ معنی قرار دینے تو بالکل غلط ہیں کہ متشابہات کی تاویل کا علم اجمالاً یا تفصیلاً کسی طرح پر انسان کو نہیں دیا گیا ورنہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ غلط ہو جائے گا کہ ہمارے دین میں عیسائیوں کے مسئلہ تثلیث کی مانند کوئی ایسا راز سربستہ نہیں ہے جو انسان کی عقل اور سمجھ سے بالاتر ہو۔

امام نووی شرح صحیح مسلم میں تاویل متشابہات کے متعلق لکھتے ہیں: یبعد ان یخاطب اللہ عبادہ بما لا سبیل لاحد من الخلق الی معرفتہ وقد اتفق اصحابنا و غیرھم من المحققین علی انہ یستحیل ان یتکلم اللہ تعالیٰ بما لا یفید یعنی بعید از عقل ہے کہ اللہ جل شانہ اپنے بندوں سے ایسے کلام کے ساتھ خطاب کرے جس کے معنی سمجھنے کی کوئی سبیل کسی مخلوق کے لئے نہ ہو اور ہمارے علمائے مذہب اور ان کے سوا اور محققین اس بات پر متفق ہیں کہ خدا تعالیٰ کا

ایسے کلام کے ساتھ متکلم ہونا جو مفید معنی نہ ہو محال ہے۔

غرضیکہ آیت مذکورہ کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان کو تاویل متشابہات کا علم قطعاً نہیں دیا گیا بلکہ یہ معنی ہیں کہ خاص کر مبدا و معاد کے متعلق جو باتیں انسان کی سمجھ بوجھ سے باہر ہیں اور جن کا بیان آیاتِ متشابہات میں بطور مجاز و استعارہ کے واقع ہوا ہے اور جن پر ایمان لانے کو یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (2:3) کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ان کی حقیقت اور کنہ خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا اور اس لئے انسان جن الفاظ و عبارات سے ان حقائق کو تعبیر کرے گا وہ تعبیر ناقص اور ادائے معنیٔ مقصود سے قاصر ہوگی۔

طیبی شرح مشکوٰۃ میں لکھتا ہے کہ المتشابه الذی یحذر منه هو صفات الله تعالیٰ التی لا کیفیة لها والاوصاف القیمة التی لا سبیل الیٰ ادراکها بالقیاس والا ستنباط ولا سبیل الی استحضارها فی النفوس۔ یعنی جن متشابہات کے اتباع سے بچنے کا حکم ہے وہ صفاتِ باری تعالیٰ یا قیامت کے حالات کا بیان ہے جو قیاس اور استنباط سے دریافت نہیں ہوسکتا اور نہ لوگوں کو اس کا تصور دلانے کی کوئی سبیل ہے۔''

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ آیاتِ متشابہات میں وہ اسرار و حقائق بطور استعارہ یا تمثیل کے بیان ہوئے ہیں اور الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوئے۔ مثلاً سورۂ تکویر میں ہولِ قیامت کا بیان ان لفظوں میں کیا گیا ہے وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ (81:4) یعنی جبکہ عنقریب بیاہنے والی اونٹنیاں چھٹی پھریں گی اور ان کی کوئی خبر نہیں لے گا بے شک ہول قیامت کی جس کیفیت کو اس تمثیل میں بیان کیا گیا ہے اس کے ادراک سے انسان کی عقل قاصر ہے اور اس کی قدرت سے باہر ہے کہ اس کیفیت کو کسی لفظ یا عبارت کے ذریعے سے پورا پورا ادا کر سکے لیکن یہ سمجھنا اس کی طاقت سے باہر نہیں ہے کہ یہ بیان اس کیفیت کی تمثیل ہے اور ایک اونٹ چرانے والی قوم جس کی دولت اونٹ اور اونٹنیوں کے سوا کچھ نہ تھی اس کو ہولِ قیامت کا تصور دلانے کے لئے کوئی اسلوب اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ عرب اپنی الف و عادت کے سبب اس بات کو ناممکن سمجھتے تھے کہ جب اونٹنی بیاہنے کے قریب ہو اس وقت مالک اس کی نگرانی سے غافل ہو جائے۔ پس انہوں نے اس وقت کو کیسا ہولناک تصور کیا ہوگا جبکہ ایسی اونٹنیوں کی خبر گیری کا ہوش باقی نہ رہے گا۔

اسلاف کا مسلک: لیکن یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاویل متشابہات کا علم خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہ تھا تو سلف صالح تاویل کرنے کو کیوں ناجائز سمجھتے تھے اور جو تاویل کا مرتکب ہوتا تھا اس سے کس لئے مواخذہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے صبیغ بن عسل کو اتباع متشابہات پر سزا دلوائی اور مدینہ منورہ سے جلاوطن کر کے بصرے کو بھجوا دیا۔ اور جب امام مالک سے استواء علی العرش کا مطلب پوچھا گیا تو انہوں نے اس کے سوا کوئی جواب نہیں دیا کہ ''استواء کے معنی معلوم ہیں اور اس کی کیفیت مجہول ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس سے سوال کرنا بدعت ہے۔''

سو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا' اس وقت اہل کتاب تحریفِ کتبِ مقدسہ کے سبب سے

نہایت بدنام تھے وہ اکثر اپنے اغراضِ فاسدہ کے لئے کتبِ مقدسہ کے معنی لوگوں کو غلط بتاتے تھے اور اس طرح دین میں رخنہ ڈالتے تھے چنانچہ قرآن مجید میں جا بجا ان پر تحریف کا الزام لگایا گیا ہے اور بہت سی حدیثیں اس مضمون کی صحاح وغیرہ میں موجود ہیں بلکہ خود اہلِ کتاب نے تسلیم کیا ہے کہ بلاشبہ قدیم یہودی اور عیسائی عالم بائبل کی کتابوں میں تحریف معنوی کے مرتکب ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ تحریف سے زیادہ کوئی چیز دین کے حق میں خطرناک نہیں ہوسکتی اور اہل کتاب اس کی مثال قائم کر چکے تھے اور چونکہ مسلمانوں کو بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت تھی اور دونوں اصولِ دین میں عموماً باہمد گر مشابہت رکھتے تھے اس لئے مسلمانوں کا سب سے زیادہ میل جول اہل کتاب کے ساتھ تھا۔ لہٰذا ان میں تحریف کا فتنہ پھیلنے کا قوی احتمال تھا۔ چنانچہ منجملہ بہت سی بندشوں کے جو شارع نے اسلام میں انسدادِ تحریف کے لئے باندھیں ایک یہ تھی کہ آیاتِ متشابہات کے معنی میں [1] چھان بین کرنے کی مذمت کی گئی اور قرآن میں صاف کہہ دیا گیا کہ: فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ (3:7) اور آنحضرت ﷺ نے عموماً قرآن کی تفسیر کی نسبت فرمایا کہ: من فسر القران برایہٖ فلیتبوٴ مقعدہ من النار اور جھوٹی روایت کرنے کی نسبت فرمایا کہ من کذب علی متعمدا فلیتبوٴ مقعدہ من النار اور جھوٹی روایت کرنے کی نسبت فرمایا کہ من کذب علیٰ متعمداً فلیتبئو مقعدہ من النار۔ اسی بناء پر سلف صالح متشابہات کی تاویل سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ باوجودیکہ وہ تشبیہہ کے عقیدے سے بالکل مبرا تھے اور جس بات میں تشبیہہ کا ادنیٰ شائبہ پاتے تھے اس سے حذر کرتے تھے پھر بھی جو آیتیں تشبیہہ پر دلالت کرتی تھیں اس کی تاویل سے ہمیشہ سکوت کرتے اور ان کے ظاہری معنوں سے ہرگز تجاوز نہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم آیاتِ متشابہات کے ظاہری معنوں پر ایمان رکھتے ہیں اور انکے اصلی معنوں کی جو خدا نے مراد رکھے ہیں تصدیق کرتے ہیں اور ان کا علم خدا پر چھوڑتے ہیں کیونکہ ان کو سمجھنے کی ہم کو تکلیف نہیں دی گئی۔ بعضے یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ مثلاً ید یا وجہ یا استواء کا ترجمہ تک دوسری زبان میں نہیں کرتے تھے اور اگر کسی ایسی آیت کے ترجمے کی ضرورت ہوتی تھی تو انہیں الفاظ کو بعینہٖ ترجمے میں رکھ دیتے تھے۔ حالانکہ عربی زبان جس میں شاعری نزول قرآن کے وقت حد کمال کو پہنچی ہوئی تھی استعارہ و کنایہ اور اقسام مجاز سے مالا مال تھی اور اسی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا۔ باوجود اس کے علمائے سلف محض اس نیت سے کہ دین میں فتنہ پیدا نہ ہو اور اہل اسلام میں مثل اہل کتاب کے تحریف کا باب مفتوح نہ ہونے پائے تاویلِ متشابہات اور تفسیر بالرائے سے اجتناب کرتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا متشابہات قرآن کے الفاظ کو ان کے حقیقی معنوں پر مقصود رکھتے تھے اور بغیر سخت ضرورت کے ان کو مجازی معنوں پر محمول نہ کرتے تھے اور کسی آیت کے تفسیر کرنے پر جب تک کوئی روایت اس کی موید نہ ہو عموماً مبادرت نہ کرتے تھے۔ حالانکہ تفسیر بالرائے سے ممانعت ہونے کے یہ معنی نہیں کہ کسی آیت کے معنی جب تک کہ اس کی تفسیر کسی حدیث سے ثابت نہ ہو بیان کرنے جائز نہیں ہیں۔ چنانچہ امام غزالی اور صاحب مجمع البحار اور دیگر

[1] یعنی جو حقائق انسانی عقل سے ماوراء ہیں اور ان کا بیان مجاز و استعارہ کی شکل میں ہوا ہے ان کی کنہ و حقیقت متعین کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ (طلوع اسلام)

محققین نے تصریح کی ہے کہ اگر حدیث مذکور کے یہ معنی ہوں تو آنحضرت ﷺ کا ابن عباس کے حق میں یہ دعا کرنا کہ اللھم فقھہ فی الدین و علمہ التاویل نعوذ باللہ بیکار ٹھہرتا ہے۔ باوجود اس کے کہ سلفِ صالحین جہاں تک ہوسکتا تھا بغیر روایت کے سنے تفسیر قرآن میں دم نہ مارتے تھے۔ تاکہ جس مصلحت سے شارع نے تفسیر بالرائے کی ممانعت فرمائی ہے وہ مصلحت فوت نہ ہو اور تحریف کا راستہ محدود رہے۔

ہمارے زمانے کا تقاضا:

لیکن یہ مصلحت اسی وقت تک محدود رہ سکتی تھی جب تک کوئی اور اس سے بھی زیادہ ضروری اور مہتم بالشان مصلحت پیش نہ آئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو آیتیں بظاہر تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں جب ان کے اصلی معنی بیان کرنے سے علماء نے سکوت کیا اور ان کو محض حقیقی معنوں پر مقصور رکھا تو ایک طرف تو خود مسلمانوں میں حشویہ اور غلاۃ شیعہ عقیدۂ تشبیہ میں غلو کرنے لگے اور دوسری طرف جوں جوں یونانی فلسفہ کا رواج زیادہ ہوتا گیا اسی قدر آیاتِ متشابہات کے معنوں پر زیادہ چون و چرا ہونے لگی اور مخالفین طرح طرح کے شبہات قرآن پر وارد کرنے لگے۔ اب علمائے اسلام کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ سلف صالح نے جو محض ازراہِ مصلحت زبانوں پر مہر لگا رکھی تھی اس کو توڑ دیا جائے اور جو الفاظ قرآن مجید میں درحقیقت مجاز، استعارہ کے طور پر اطلاق کئے گئے ہیں بقدرِ ضرورت ان کے اصلی معنی صاف صاف بیان کئے جائیں۔

چنانچہ سب سے پہلے علمائے معتزلہ نے تاویل متشابہات کی راہ کھولی۔

آخر کو اسلام میں عموماً یہ قاعدہ مسلم ٹھہر گیا کہ جب نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو تو نقل کے ایسے معنی لینے چاہئیں جن سے وہ تعارض رفع ہو جائے۔ یعنی جب نص شرعی کے حقیقی معنی دلیل قاطع عقلی کے خلاف ہوں تو اس کو اصولِ عربیت کے موافق مجازی معنوں پر محمول کرنا چاہئے اور یہی معنی تاویل کے ہیں۔

یہ اصول علمِ کلام کی عام کتابوں مثلاً مقاصد۔ مواقف۔ تفسیر کبیر، دُررِ غُرر، تہافتہ الفلاسفہ اور فصل المقال قاضی ابن رشد وغیرہ وغیرہ میں مفصل بیان کیا گیا ہے اور شیخ حسین آفندی طرابلسی نے جو ابھی ایک کتاب موسوم بہ حمیدیہ حکمائے زمانہ حال کے مقابلہ میں لکھی ہے۔ اس میں بھی اس اصول کو قاعدہ مسلمہ اہل اسلام قرار دیا ہے بلکہ شیخ موصوف نے اپنے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو جو معجزاتِ حسیہ کو علوم جدیدہ کے خلاف سمجھتے ہیں یہ ہدایت کی ہے کہ: علیھم ان یقنعوا بما تقبلہ عقولھم ثم مالم تقبلہ و یرفضہ البرھان العقلی القاطع یرجعون فیہ الی التاویل الجامع بین النقل والعقل (حمیدیہ، ص:38) یعنی ان کو چاہئے کہ جس بات کو ان کی عقل قبول کرے اس پر قناعت کریں اور جس بات کو وہ قبول نہ کرے اور برہان عقلی اس کے منافی ہو تو تاویل کی طرف رجوع کریں جس سے عقل اور نقل میں تطبیق ہو جائے۔

پہلے بھی ایسا ہوا ہے: اگرچہ ابوالحسن اشعری جو کہ فرقہ اشاعرہ کے سرگروہ ہیں متشابہات کی تاویل کو جائز نہیں سمجھتے مگر ان کی یہ ممانعت صرف ان راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لئے مخصوص معلوم ہوتی ہے جن کے دل ہر قسم کے وساوس اور شبہات سے

پاک ہیں کیونکہ ضرورت کے وقت کیا معتزلی اور کیا اشعری اور کیا اور اسلامی فرقے سب کو ناگزیر متشابہات کتاب وسنت کی تاویل کرنی پڑتی ہے۔ امام غزالی جو خود بھی اشعری المذہب ہیں رسالہ التفرق بین الاسلام والزندقۃ میں لکھتے ہیں کہ ''اسلام کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جو تاویل کا محتاج نہ ہوا ہو۔ سب سے زیادہ تاویل سے بچنے والے امام احمد بن حنبلؒ ہیں۔ باوجود اس کے وہ سب سے زیادہ بعید تاویلات کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

اس مقام پر ہم آیت بطور مثال کے اس غرض سے لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ آیاتِ متشابہات کے معنی ابتداء میں کیا سمجھے جاتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ علم وحکمت کی ترقی اور زمانے کی ضرورتوں سے ان کے کیا معنی قرار دیئے گئے۔

آیۃ الکرسی میں جو جملہ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ (2:255) آیا ہے اس کی تفسیر میں امام رازی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ کرسی کو پہلے ایک جسم عظیم (جو زمین وآسمان پر محیط ہے) سمجھا جاتا تھا۔ بعضے اسی کو عرش اور بعضے عرش وکرسی دونوں کو جدا جدا جسم سمجھتے تھے۔ بعضے کرسی کو خدا کے قدم رکھنے کی جگہ کہتے تھے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں علوم حکمیہ نے رواج پایا اور علماء کو زمانے کی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ مہر سکوت کو توڑ دیا جائے اور عرش وکرسی وغیرہ الفاظ سے جو معنی اصل مقصود ہیں وہ صاف صاف بیان کئے جائیں۔

مزید تحقیق کی ضرورت: لیکن چونکہ اس زمانے کی علمی تحقیقات نہایت محدود تھیں اس لئے بہت سے شبہات جو اس زمانے میں قرآن کی نسبت پیدا ہو سکتے ہیں اس زمانہ میں ان کا خطرہ بھی کسی کے دل میں نہیں گزرتا تھا اور اس وجہ سے بہت سی آیات متشابہات جو درحقیقت تاویل طلب تھیں ان کی تاویل کرنے کی ضرورت علمائے سلف کو محسوس نہیں ہوئی مثلاً جب تک یونانی فلسفہ اسلام میں نہیں پھیلا اور الفاظِ قرآنی میں شک اور وسوسے نے راہ نہیں پائی لوگ ان آیتوں کے الفاظ کو (جن سے زمین کا مثل فرش کے بچھا ہوا ہونا مفہوم ہوتا ہے) ان کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے۔ اور اب تک بھی ان ملکوں کے بعض علماء [1] جہاں کسی زمانے میں یونانی فلسفے کا رواج نہیں ہوا زمین کو مثل فرش کے بچھا ہوا سمجھتے ہیں۔ مگر جب علم وحکمت کا مسلمانوں میں رواج ہوا اور دلائل قاطعہ سے زمین کی گردیت ثابت ہوگئی تو علمائے متکلمین کو تصریح کرنی پڑی کہ قرآن میں جو زمین کی نسبت الفاظ فرشنٰھا اور دحاھا اور طحٰھا اطلاق کئے گئے ہیں وہ اپنے حقیقی معنوں پر محمول نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ اس وقت زمین کی حرکت کا مسئلہ سائنس کے درجے تک نہیں پہنچا تھا اس لئے قرآن کے بعض الفاظ جو زمین کے ساکن ہونے پر دلالت کرتے ہیں ان کی کچھ تاویل نہیں کی گئی یا مثلاً جن آیتوں سے مینہ کا آسمان سے برسنا سمجھا جاتا ہے جب تک قرآن کے الفاظ میں کسی نے چون وچرا نہیں کی لوگ ان آیتوں کو ان کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے مگر جب دلائل سے

---

[1] شیخ حسین آفندی نے رسالہ حمیدیہ میں اپنے زمانہ کے ایک قشیری عالم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ دین اسلام میں امریکہ کے وجود پر اعتقاد رکھنا جائز نہیں کیونکہ اس سے زمین کی گردیت کا اعتقاد کرنا لازم آتا ہے جو اسلامی عقیدے کے خلاف ہے۔ شیخ اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ ''اس نادان نے اپنی جہالت سے مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ ایک محسوس چیز کا انکار کر دیں اور اپنے دین کو لوگوں کی نظر میں مضحکہ بنائیں'' حالی۔

یہ بات ثابت ہوگئی کہ مینہ درحقیقت آسمان سے نہیں برستا تو لفظ سماء جو قرآن میں جابجا وارد ہوا ہے۔ اس سے مجازی معنی یعنی جانب فوق مراد لی گئی۔ لیکن چونکہ اس وقت یہ تحقیق نہیں ہوا تھا کہ آسمان درحقیقت کوئی جسم محیطِ عالم مثل گول گنبد کے جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے نہیں ہے بلکہ تمام ثوابت اور سارے فضائے بسیط میں بکھرے ہوئے اور ایک عجیب کرشمۂ قدرت سے جس کا نام جاذبیہ یعنی کشش ہے اپنی اپنی جگہ قائم ہیں اس لئے جو الفاظ کہ آسمان کے موجود ہونے یا مجسم ہونے پر بظاہر دلالت کرتے تھے ان کی کچھ تاویل نہیں کی گئی۔

اشعریہ اور معتزلہ: اسی سبب سے قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اور بہت سے الفاظ ایسے باقی رہ گئے جن میں درحقیقت تاویل کی ضرورت تھی مگر چونکہ وہ ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوئی۔ اس لئے ان کی تاویل کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا اور سب سے بڑا مانع تاویلِ متشابہات پر جرأت کرنے کا یہ تھا کہ امام ابوالحسن اشعری جو تاویلِ متشابہات کے باب میں سلف صالح کے پورے مقلد تھے اور اس لئے اس کو بغیر اشد ضرورت کے جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے مذہب نے چوتھی صدی ہجری کے آخر میں ترقی کرنی شروع کی اور چھٹی صدی میں وہ تقریباً تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گیا اور معتزلہ جنہوں نے ملاحدہ اور دیگر مخالفین اسلام کے مقابلہ میں سب سے پہلے تاویلِ متشابہات کی ضرورت کو محسوس کیا تھا اور ان کو عندالضرورت واجب سمجھتے تھے، جوں جوں اشاعرہ کے مذہب کو ترقی ہوتی گئی اس قدر وہ ان کا مذہب اور ان کے اصول اور ان کی تصنیفات ناپید ہوتی گئیں۔ اکثر بادشاہوں نے جبراً اشعری مذہب کو رواج دیا اور معتزلہ کے اصول کا استیصال کیا۔ یہاں تک کہ وہ رفتہ رفتہ دنیا سے معدوم ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تمام اسلامی دنیا میں زیادہ تر اشاعرہ کی تفسیریں پائی جاتی ہیں جن میں بغیر سخت ضرورت کے متشابہات کی تاویل میں کسی نے دم نہیں مارا اور جس قدر تاویلات ان تفسیروں میں منقول ہیں ان کا ماخذ زیادہ تر وہی معتزلہ کی تفاسیر ہیں جو ایک آدھ کے سوا اب بالکل مفقود ہیں صرف ان کے اقوال جستہ جستہ اشاعرہ کی تفسیروں میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ قفال جن کا قول کرسی کی تفسیر میں امام رازی نے نقل کیا ہے وہ بھی معتزلہ میں شمار کئے گئے ہیں۔

اگرچہ امام ابوالحسن اشعری سے جیسا کہ علامہ شہرستانی نے ملل ونحل میں لکھا ہے ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ عندالضرورت تاویل کرنی جائز ہے اور اسی بناء پر اشاعرہ بھی مثل دیگر فرقوں کے جہاں نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو تاویل کو جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک دیکھا جاتا ہے وہ متشابہات کی تاویل پر حتی المقدور جرأت نہیں کرتے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں۔ من اصول الدین ترك الخوض بالعقل فی المتشابہات من الکتاب و السنۃ اس کے بعد فرماتے ہیں ومن ذلك (ای من المتشابہات) امور کثیر لا یدری اریدت بہ حقیقۃ الکلام او المجاز اقرب الیہا وذلك فی لم یجمع علیہ الا اللامۃ ولم ترتفع فیہ الشبہۃ۔ یعنی قرآن اور حدیث میں از قبیل متشابہات بہت سے بیانات ہیں جن کی نسبت نہیں معلوم کہ ان کے حقیقی معنی مقصود ہیں یا ایسے مجازی معنی جو حقیقت سے قریب تر ہوں اور یہ تردد ان بیانات میں ہے جن کی نسبت اجماع امت سے فیصلہ نہیں ہوا اور اشتباہ رفع نہیں ہوا۔''

شاہ ولی اللہ کا مسلک: شاہ صاحب کے اس قول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید میں ایسے بہت سے مقامات باقی ہیں جن میں حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کا احتمال ہے اور باوجودیکہ صدہا تفسیریں مبسوط لکھی جا چکی ہیں مگر آج تک کسی مفسر نے اس بات کا فیصلہ نہیں کیا کہ ان مقامات پر جو الفاظ حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کو متحمل ہیں ان سے درحقیقت حقیقی معنی مقصود ہیں یا مجازی۔

قطع نظر اس محققانہ کلام کے جو شاہ صاحب نے متشابہات کے باب میں لکھا ہے تفسیر کبیر اور حجۃ اللہ البالغہ کے دیگر حوالوں سے جو ہم پہلے دے چکے ہیں صاف پایا جاتا ہے کہ خدا کا کلام جو کافۂ انام کی ہدایت کے لئے نازل ہوتا ہے اس کا طرز بیان ایسا ہونا چاہئے کہ ہر طبقہ اور ہر درجہ اور ہر زمانے کے لوگ اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی معلومات کے موافق اس سے ہدایت پاسکیں۔ جب انسان کی معلومات نہایت محدود اور اس کی سمجھ محض ابتدائی حالت میں ہو اس وقت بھی اس کی تعلیم سے وہی نتیجہ حاصل ہو جو علم انسانی کے منتہائے ترقی پر پہنچنے کے وقت حاصل ہو۔ ورنہ اس کی نسبت یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ کافۂ انام کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے اور اس تقدیر پر امکان سے خارج ہے کہ جب تک انسان میں علمی ترقی کرنے کی قابلیت باقی ہے کلام الٰہی نئی تفسیروں سے بالکل مستغنی ہو جائے کیونکہ جس قدر انسان پر حقائق موجودات زیادہ منکشف ہوتے جائیں گے اسی قدر کلام الٰہی کے معنوں سے زیادہ پردے مرتفع ہوں گے۔

قرآنی حقائق لامتناہی ہیں: علامہ ابن الحاج اپنی مشہور کتاب ''مدخل'' میں لکھتے ہیں قال علیہ الصلوٰۃ والسلام فی القران لا تنقضی عجائبہ ولا یخلق علیٰ کثرۃ الرد فعجائب القران لا تنقضی الی یوم القیمہ فکل قرن لا بدلہ ان یأخذمنہ فوائد جمۃ خصہ اللہ تعالیٰ بہا وضمہا الیہ برکۃ ھذہ الامۃ سائرۃ الی یوم الساعۃ۔'' یعنی ''آنحضرت ﷺ نے قرآن کے باب میں فرمایا ہے کہ ''اس کے عجائب یعنی دقائق واسرار جو اس میں مضمر ہیں ختم نہ ہوں گے اور وہ باوجود بار بار دہرانے کے پرانا نہ ہوگا۔'' پس قرآن کے عجائب قیامت تک ختم ہونے والے نہیں ہیں اور اس لئے ہر زمانہ کے لوگوں کو چاہئے کہ اس سے فوائد کثیرہ جو ان کے حصے میں آئے ہیں حاصل کریں تاکہ اس امت کی برکت روز قیامت تک جاری رہے۔

اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں ''قال علیہ الصلوٰۃ والسلام مثل امتی کمثل المطر لا یدری اولہ خیر ام اخرہ۔ یعنی فی البرکۃ والخیر والدعوۃ الی اللہ تعالیٰ و تبئین الاحکام یعنی آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''میری امت کی مثال مینہ کی سی ہے جس کا نہیں معلوم اول بہتر ہے یا آخر'' یعنی برکت اور خیر میں' لوگوں کو خدا کی طرف بلانے میں اور احکام الٰہی کے بیان کرنے میں۔

دونوں مذکورہ بالا حدیثوں سے جو علامہ ابن الحاج نے نقل کی ہیں صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے عجائب اور دقائق ہمیشہ وقتاً فوقتاً انسان پر ظاہر ہوتے رہیں گے اور جس طرح امت کے اول قرنوں میں قرآن کے بہت سے دقائق واسرار امت پر ظاہر ہوئے ہیں اسی طرح اس کے اخیر قرنوں میں بہت سے دقائق واسرار دنیا پر منکشف ہوں گے۔

امام حجۃ الاسلام غزالیؒ اس باب میں لکھتے ہیں کہ کم من معان دقیقۃ من اسرار القران یخطر علی قلب المتجر دین للذکر والفکر یخلو عنھا کتب التفاسیر ولا یطلع علیھا افاضل المفسرین یعنی قرآن کے ایسے بہت سے دقائق واسرار جن سے تفسیر کی کتابیں خالی ہوتی ہیں اور بڑے بڑے مفسروں کو ان کی خبر نہیں ہوتی ان لوگوں کے دلوں پر کھلتے ہیں جو ہمہ تن قرآن کے ذکر اور فکر میں محو ہو جاتے ہیں۔

ابتدائی اعتراض کا جواب

(قرآن مجید میں مزید تفسیر کی گنجائش باقی نہیں ہے)

اوپر کے بیان سے غالباً اس بات میں کچھ شبہ نہ رہا ہوگا کہ باوجود بے شمار تفسیروں کے جو گزشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئی ہیں قرآن کی تفسیر سے ابھی استغنا نہیں ہوا۔ بہت سے مقامات اس میں اب بھی ایسے موجود ہیں جن کے معنی متعین نہیں ہوئے اور بہت سے عجائب اور دقائق واسرار ایسے باقی ہیں جو امت پر ہنوز منکشف نہیں ہوئے اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ جن مقامات کی نسبت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اجماع امت سے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ وہ الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں بولے گئے ہیں یا مجازی معنوں میں۔ آیا عند الضرورت اجماع امت کے خلاف ان مقامات میں خوض کرنا اور ان متشابہ الفاظ کے معنی متعین کرنا مناسب ہے یا نہیں؟ اور اگر مناسب ہے تو اسلام کو اب ایسی ضرورت درپیش ہے یا نہیں کہ خرق اجماع پر مبادرت کی جائے اور جن متشابہات کی تاویل سے اب تک سکوت کیا گیا ان کے معنی صاف صاف بیان کئے جائیں۔

تقاضائے وقت: ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائے اسلام پر اس قاعدے پر برابر عمل ہوتا چلا آیا ہے کہ ضرورتیں ممنوعات کو مباح وجائز کر دیتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ صحابہ اور تابعین کسی مسئلہ پر رائے اور قیاس سے گفتگو کرنے کو نہایت مکروہ جانتے تھے۔ چنانچہ ابن مسعودؓ سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا چونکہ ان کو اس کے متعلق کوئی حدیث معلوم نہ تھی۔ انہوں نے کہا کہ میں مکروہ جانتا ہوں اس بات کو کہ تیرے لئے حلال کر دوں جس کو خدا نے حرام کیا ہے اور حرام کر دوں جس کو خدا نے حلال کیا ہے۔

ابن عمرؓ نے جابر بن زید فقیہ بصرہ سے کہا کہ قرآن وحدیث کے بغیر کوئی فتویٰ نہ دینا اگر تو نے ایسا کیا تو خود بھی ہلاک ہوگا اور اوروں کو بھی ہلاک کرے گا۔

ابوسلمہؓ جب بصرے میں آئے تو انہوں نے حسن بصری سے کہا کہ ''میں نے سنا ہے کہ تم اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہو سو کبھی بغیر قرآن وحدیث کے فتویٰ نہ دینا۔''

شعبیؒ سے کسی نے پوچھا کہ ''جب تم لوگوں سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تھا تو تم کیا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا جب ہمارے مجمع میں کسی سے کوئی سوال پوچھا جاتا تھا تو وہ ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ اس کے سوال کا جواب دو اور دوسرا تیسرے کی طرف۔ یہاں تک کہ پھر اول شخص تک سوال کی نوبت پہنچتی تھی۔ یعنی جب کسی کو اس مسئلہ کے متعلق کوئی

روایت معلوم نہ ہوتی تھی تو جواب دینے سے سکوت کرتے تھے اور قیاس کو بالکل دخل نہ دیتے تھے۔

مگر آخر کار ضرورتوں نے قیاس کو ایسی ضروری چیز بنا دیا کہ وہ کتاب وسنت کا ہم پلہ اور دلائل شرعیہ سے ایک دلیل قرار دیا گیا۔

ایک زمانہ تھا کہ قدر کے مسئلہ پر گفتگو کرنا ممنوع سمجھا جاتا تھا کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے کی مصلحت کے موافق اس مسئلہ میں خوض کرنے سے منع فرمایا تھا اور لوگوں کو قدر کے متعلق بحث کرتے دیکھ کر نہایت غیظ وغضب میں ارشاد کیا تھا کہ ابھذا امرتم ام بھذا ارسلت مگر جب ضرورت داعی ہوئی تو علماء کو چار و ناچار اس پر بحث کرنی پڑی۔ بنی امیہ کے عہد میں جب استحکام سلطنت کے لئے سخت خونریزیاں ہونے لگیں اور ارکان سلطنت سے لوگوں نے متعجب ہو کر پوچھا کہ مسلمان کیوں قتل کئے جاتے ہیں؟ تو ان کو یہ جواب ملا کہ القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ آخر کار علماء کو یہ عقدہ حل کرنا پڑا اور اس قدر کے معنی بتانے پڑے اور یہ مسئلہ علم کلام کا ایک نہایت اہم اور ضروری مسئلہ قرار دیا گیا۔

متشابہات کی تاویل میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے جب تک شک اور وسوسے کا زمانہ نہیں آیا کسی نے دم نہیں مارا مگر آخر کار اس زمانے کی ضرورتوں کے موافق علماء کو تاویل پر مبادرت کرنی پڑی اور یہ بات قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام الہامی کتابیں اور صحیفے جو انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوئے چونکہ ان میں کثرت سے آیاتِ متشابہات وارد ہوئی تھیں اس لئے اگرچہ ایک مدتِ دراز تک لوگ ان کو حقیقی معنوں پر محمول کرتے رہے مگر جس قدر علمِ انسانی ترقی کرتا گیا اسی قدر ان کے مجازی معنی جو اصل مقصود تھے منکشف ہوتے گئے۔

قرآن مجید میں جو الفاظ یا آیتیں اب تک ایسی موجود ہیں جن کی نسبت بقول شاہ ولی اللہ صاحب کے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ ان کے حقیقی معنی مقصود ہیں یا مجازی۔ اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ ان کے معنی متعین کرنے کا وقت اب آ پہنچا ہے تو اسکے سوا کوئی چارہ نہیں کہ فوراً یہ پردہ اٹھا دیا جائے اور جو معنی اصولِ عربیت کے موافق ایسے قرار پائیں جن سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے رفع ہو جائے تو بلا تامل وہی معنے اختیار کئے جائیں اگرچہ تیرہ سو برس میں کسی مفسر نے وہ معنی نہ لکھے ہوں۔

بینا و نابینا: مگر سوال یہ ہے کہ آیا ایسی ضرورت سر دست درپیش ہے جو محظورات کو مباح کر دیتی ہے؟ سوال کا جواب یہ ہے کہ:

جو لوگ زمانے کے حال سے بے خبر ہیں اور جن کے کان میں مخالفت کی کوئی آواز نہیں پہنچی ان کے نزدیک تو اس کے سوا کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں کہ جو شخص جمہور کے خلاف ایک حرف زبان سے نکالے اس کو فوراً دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جائے ان کے حال پر تو یہ شعر صادق آتا ہے کہ

آفاتِ بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب
ہنستے ہیں ناخدا پر، روتا ہے ناخدا جب

مگر وہ لوگ جو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ مغربی تعلیم جس قدر دنیا میں زیادہ پھیلتی جاتی ہے۔ اسی قدر مذہبی عقائد اور

مذہبی خیالات لوگوں کے دلوں سے کافور ہوتے جاتے ہیں۔ ان کو وہ ضرورت روز روشن کی طرح نظر آتی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ جس ضرورت نے حکمائے اسلام یعنی قدیم متکلمین کو سلف صالح کے برخلاف تاویل متشابہات پر مجبور کیا تھا وہ ضرورت ہمارے زمانے میں حد غایت کو پہنچ گئی ہے۔ اس زمانے میں حکمت اور فلسفہ خاص کر علماء و مصنفین کے گروہ میں محدود تھا جو معقولات کو زیادہ تر منقولات کی تقویت اور دین کی حمایت کے لئے حاصل کرتے تھے مگر اس زمانے میں مغربی تعلیم ضروریاتِ زندگی میں داخل ہوگئی ہے۔ ہر شخص عام اس سے کہ نوکری پیشہ ہو تاجر ہو یا اہل حرفہ ہو مجبور ہے کہ اولاد کو مغربی تعلیم دلوائے اور اس لئے مغربی علوم کی تعلیم مذہب کے حق میں بہ نسبت یونانی علوم کے زیادہ خطرناک ہوگئی ہے اس کے سوا اس زمانے کے علوم زیادہ تر محض قیاسات پر مبنی تھے اور اس لئے جو شبہات ان سے مذہب کی نسبت پیدا ہوتے تھے ان کے دفعیے کے لئے اکثر حالتوں میں صرف لانسلم کہہ دینا کافی تھا۔ مگر اس زمانہ میں علم کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ اور استقراء پر رکھی گئی ہے اور اس لئے جو شکوک اب مذہب کی نسبت پیدا ہو سکتے ہیں وہ صرف لانسلم کہہ دینے رفع نہیں ہو سکتے۔

غرضیکہ گزشتہ اور موجودہ صدی میں علم و حکمت نے بے انتہا ترقی کی ہے۔ ہزاروں باتیں جو پہلے معلوم نہ تھیں اب معلوم ہوئی ہیں۔ بہت سی باتیں جو پہلے صحیح مانی جاتی تھیں اب غلط ثابت ہوئی ہیں۔ بہت سی باتیں جو پہلے ممکن الوقوع مانی جاتی تھیں۔ اب غیر ممکن الوقوع مانی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔

اگرچہ ممکن ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آئے کہ زمانۂ حال کے اکثر مسلمات غلط ثابت ہو جائیں لیکن چونکہ حال کی تحقیقات کا مدار صرف قیاسی اور ظنی باتوں پر نہیں بلکہ زیادہ تر تجربہ اور مشاہدہ پر ہے اس لئے بہت ہی کم احتمال اس بات کا ہے کہ جو علوم اور مسائل سائنس کے درجے تک پہنچ گئے ہیں ان میں آئندہ کسی قسم کی تبدیلی واقع ہو۔ پس جو باتیں قرآن میں بظاہر زمانۂ حال کی تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتی ہیں جب تک کہ اس تحقیقات کو غلط ثابت نہ کیا جائے ضروری ہے کہ یا تو قرآن کو حقائق محققہ کے برخلاف تسلیم کریں اور یا اس کے ایسے معنی بیان کریں جو زمانۂ حال کی تحقیقات کے برخلاف نہ ہوں [1]۔ مگر ہم قرآن میں بہت سی ایسی آیاتِ متشابہات پاتے ہیں کہ اگر ان کو مجازی معنوں پر محمول کیا جائے تو نہ ہم کو اصولِ عربیت کے خلاف تکلفات لایعنی کرنے پڑتے ہیں اور نہ قرآن کے اسلوبِ بیان سے تجاوز کرنا لازم آتا ہے اور باوجود اس کے زمانۂ حال کے شبہات جو ان آیتوں کی قدیم تفسیر پر وارد ہوتے ہیں بالکل رفع ہو جاتے ہیں اور اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان آیتوں کو صرف اس خیال سے کہ جمہور مفسرین نے ان کو ہمیشہ حقیقی معنوں پر مقصود رکھا ہے ہم مجازی معنوں پر محمول نہ کریں۔

یہ جدت طرازیاں: جو لوگ سرسید کی تفسیر کی نسبت کہتے ہیں کہ:

''جو معنی قرآن کے انہوں نے لکھے ہیں نہ وہ خدا کو سوجھے نہ رسول کو۔ سو شاید سرسید کی بعض تاویلات کی نسبت یہ کہنا صحیح ہو مگر ان کی تمام تفسیر کی نسبت ایسا کہنا محض ستم ظریفی ہے۔''

---

[1] طلوع اسلام کا اس باب میں نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ مسئلہ زیر نظر کے متعلق جو کچھ ہمارے زمانے نے معلوم کیا ہے وہ حرفِ آخر نہیں ہمیں اس باب میں مزید تحقیق کا انتظار کرنا چاہئے۔ جب زمانہ کی علمی سطح اور بلند ہوگی تو اس کی تحقیق یقیناً قرآن کی تائید کرے گی۔

یہ بات تو خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو معنی سرسید نے قرآن کے بیان کئے ہیں وہ خدا اور خدا کے رسول کو سوجھے تھے یا نہیں؟ مگر اس میں شک نہیں کہ ان معنوں کا اس زمانے میں جبکہ قرآن نازل ہوا مخاطبین پر ظاہر کرنا شارعؑ کے مقصود کے بالکل برخلاف تھا۔

صاف بات: ہم اوپر بحوالہ تفسیر کبیر اور حجۃ اللہ البالغہ کے لکھ چکے ہیں کہ قرآن میں انسان کی سیدھی سادھی سمجھ کے موافق (جو علم وحکم تک پہنچنے سے پہلے اس کی خلقت میں ودیعت تھی) خطاب کیا گیا ہے اور بہت سے حقائق مجاز استعارہ وتمثیل کے پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ تاکہ جب تک مخاطبین اپنی عقلِ طبعی سے ترقی کر کے علم وحکمت کے اعلیٰ درجہ تک نہ پہنچیں اس وقت تک جو معنی ان الفاظ سے بظاہر متبادر ہوں انہی پر قانع رہیں۔ مگر جوں جوں حقائقِ اشیاء ان پر منکشف ہوتے جائیں اسی قدر ان الفاظ کے معنی مقصود ان پر کھلتے جائیں۔ پس جو معنی قرآن کے اب یا آئندہ ایسے بیان کئے جائیں جو اصولِ عربیت اور اسلوب قرآن کے خلاف نہ ہوں اور باوجود اس کے ان کے اختیار کرنے سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے بخوبی رفع ہوتا ہو اس کی نسبت صرف اس بناء پر کہ نزول قرآن کے وقت شارع نے ان کو بیان نہیں کیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ معنے نہ خدا کو سوجھے نہ رسول کو۔

قرآن مجید میں بہت سی آیتیں جبر پر اور بہت سی قدر پر دلالت کرتی ہیں۔ مگر آنحضرت ﷺ نے مسئلہ جبر وقدر کی نسبت اس کے سوا کچھ نہیں فرمایا کہ لوگوں کو اس پر بحث کرتے دیکھ کر نہایت ناراضی ظاہر کی اور اس پر بحث کرنے سے منع فرمایا۔ باوجود اس کے جب ضرورت داعی ہوئی تو صحابہ ہی کے وقت میں اس پر بحث شروع ہوگئی۔ چنانچہ عمرو بن عاص اور ابو موسیٰ اشعری میں جو اس مسئلہ کے متعلق گفتگو ہوئی وہ ملل ونحل شہرستانی میں مذکور ہے اور پھر مفسرین اشاعرہ نے بمقابلہ معتزلہ کے ان آیات کی تفسیر میں جو جبر یا قدر پر دلالت کرتی ہیں اس مسئلہ پر کوئی تیر اپنے ترکش میں باقی نہیں چھوڑا۔ پھر کیا کوئی اشعری یہ کہہ سکتا ہے کہ جو معنی ان آیتوں کے ہمارے علماء اور ائمہ نے بیان کئے ہیں وہ خدا کو سوجھے نہ خدا کے رسول کو۔

یہاں تک جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے صرف اس قدر ثابت کرنا مقصود تھا کہ قرآن مجید میں باوجود بے شمار تفسیروں کے جو گزشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئیں اب تک نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ:

سرسید نے جن آیتوں کی تفسیر جمہور مفسرین کے خلاف لکھی ہے وہ کہاں تک اصولِ عربیت اور اسلوبِ قرآن کے موافق ہے؟

جن اعتراضات کو رفع کرنے کی غرض سے انہوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے ان کے رفع کرنے کی فی الواقع ضرورت ہے یا نہیں؟

جو معیار قرآن کے الہامی ہونے کا انہوں نے قرار دیا ہے اس کے سوا کوئی دوسرا معیار قرار پا سکتا ہے یا نہیں؟ سو ان عنوانوں پر ہم آئندہ اپنے خیالات ظاہر کریں گے [1]۔

---

[1] یہ مزید بحث ہماری نظر سے نہیں گذری۔ نہ ہی اس کی اب چنداں اہمیت باقی ہے۔ (طلوع اسلام)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لُغاتُ القُرآن

ص ل و (ی)

اگرچہ صلوٰۃ اور اس کے جملہ مشتقات کا تعلق (ص۔ل۔و) ہی سے ہے لیکن علمائے لغت نے اس ضمن میں بعض ایسے مشتقات بھی بیان کئے ہیں جو (ص۔ل۔ی) سے متعلق ہیں اور ان سے بھی صلوٰۃ کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے' اس لئے اس عنوان میں مادہ کے آخر کا ''واؤ'' اور ''ی'' دونوں ہی آ گئے ہیں۔ ویسے ہم نے (ص۔ل۔ی) کا ایک جداگانہ عنوان بھی رکھا ہے جو آگے آتا ہے۔ چونکہ ''صلوٰۃ'' دین کا ایک بنیادی گوشہ ہے اور قرآنِ کریم میں یہ اصطلاح اور اس کے متعلقات بڑی کثرت سے آئے ہیں اس لئے یہ عنوان بڑا اہم اور اس کے مباحث خاص غور و فکر کے محتاج ہیں۔ ہم انہیں نسبتاً تفصیل سے بیان کریں گے۔

(1) اَلصَّلَا ــ پشت کا درمیانی حصہ' کولہے کا ڈھلوان یا وہ حصہ جس پر جانور کی دُم لگے۔ دُم کے دونوں جانب کے حصے صَلَوَانِ کہلاتے ہیں۔ اس کی جمع صَلَوٰتٌ یا اَصْلَاءٌ آتی ہے [1]۔ صَلَا۔ یَصْلُوْ۔ صَلْواً کے معنی ہیں صَلَا (مذکورہ صدر حصہ) پر مارنا۔ صَلَوْتُہٗ میں نے اس کے صَلَا پر مارا۔

(2) اَلصَّلَا کی نسبت سے' صَلَّی الْفَرَسُ تَصْلِیَۃً اس وقت کہتے ہیں جب گھوڑ دوڑ میں' دوسرے نمبر کا گھوڑا' پہلے نمبر کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے اس طرح دوڑ رہا ہو کہ پچھلے کی کنوتیاں' پہلے کی سرین سے مل رہی ہوں۔ اس گھوڑے کو جو آگے جا رہا ہو' سَابِقٌ کہتے ہیں اور دوسرے نمبر والے گھوڑے کو اَلْمُصَلِّیْ۔ اس سے صَلّٰی کے معنی ہیں اگلے کے ساتھ ملے ہوئے پیچھے پیچھے آنا۔ چنانچہ حضرت علیؓ کی ایک روایت میں ہے سَبَقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ۔ وَصَلّٰی اَبُوْبَکْرٍ وَ ثَلَّثَ عُمَرُ وَ خَبَطَتْنَا فِتْنَۃٌ ''رسول اللہ ﷺ پہلے تشریف لے گئے۔ اور آپ کے پیچھے پیچھے ابوبکرؓ اور ان کے پیچھے عمرؓ بھی چلے گئے اور ہمیں فتنوں نے بدحواس کر دیا [1]''۔

(3) تاج میں ہے کہ صَلِیَ وَاصْطَلٰی کے معنی لزوم یعنی وابستگی کے ہیں۔ یعنی کسی کے ساتھ لگے رہنا اور چمٹے رہنا۔ اسی بنا پر راغب نے کہا ہے کہ قرآنِ کریم میں جو ہے لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ [74:43] ''ہم مصلین میں سے نہیں تھے'' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ''ہم انبیاء کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے نہیں تھے''۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس

[1] تاج

جہت سے صلوٰۃ کے معنی ہوں گے احکام الٰہی سے وابستگی۔ حدود اللہ کے اندر رہنا اور کتاب اللہ سے چمٹے رہنا۔ لہٰذا تَصْلِیَۃٌ کے معنی ہیں اگلے کے پیچھے اس طرح چلنا کہ ان دونوں میں فاصلہ نہ ہو لیکن پیچھے چلنے والا آگے جانے والے سے آگے نہ بڑھے بلکہ وابستگی سے اس کا اتباع کرے۔

(4) ان تصریحات سے صلوٰۃٌ کا بنیادی مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک مختصر سی تمہید کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ خدا اور بندے کا تعلق کیا ہے؟ خدا اس ذات (Personality) کا نام ہے جو بلند ترین، مکمل ترین، مستحکم ترین اور حسین ترین ہے۔ اس نے انسان کو بھی ذات (Personality) عطا کی ہے (اور اسے ''روحنا'' کہہ کر پکارا ہے، دیکھئے عنوان ر۔و۔ح)۔ یہ ذات، ذات خداوندی کے مقابلہ میں محدود اور پست درجہ کی ہے۔ اسے اپنی نشوونما کے لئے صفات خداوندی کو اپنے سامنے بطور نصب العین رکھنا ہوتا ہے۔ ہم خدا کی ذات کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ اس نے اپنی جو صفات وحی کے ذریعہ (قرآنِ کریم میں) بیان کی ہیں ان صفات کا اپنے اندر اجاگر کرتے جانا انسانی ذات کی نشوونما کا موجب بنتا ہے۔ قرآنِ کریم نے صفات خداوندی کو ''اسماء الحسنیٰ'' سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا انسان کا فریضہ یہ ہے کہ ان اسماء (صفات) خداوندی کو اپنے سامنے بطور معیار رکھ کر، ان کے پیچھے پیچھے چلتا جائے۔

قرآنِ کریم کی سب سے پہلی سورت میں ہمیں جو دعا سکھائی گئی ہے (یعنی جس نصب العین کے حصول کو ہمارے لئے مقصد زندگی تجویز کیا گیا ہے) وہ یہ ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ [1:5] یعنی اس توازن بدوش راستے کی طرف راہنمائی کی تمنا جو ہمیں انسانیت کی منزلِ مقصود تک لے جائے۔ اور سورۃ ہود میں ہے اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ [11:56] ''میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے''۔ یعنی جس صراطِ مستقیم پر چلنے کے لئے مومنین سے کہا گیا ہے وہ وہی راستہ ہے جس پر خدا کائنات کو چلا رہا ہے۔ ہم اس راستے پر کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہنے سے چل سکتے ہیں۔ لہٰذا صلوٰۃ کا بنیادی مفہوم ہے کتاب اللہ کے ساتھ پوری پوری وابستگی سے اپنے اندر (علیٰ حدِ بشریت) صفات خداوندی کا منعکس کئے جانا۔

(5) سورۃ نور میں ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ ؕ [24:41] ''کیا تو نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ وہ ہے کہ اسی کی تسبیح کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمینوں میں ہیں۔ اور پر پھیلائے ہوئے پرند بھی۔ ہر ایک اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو اچھی طرح جانتا ہے''۔ یعنی کائنات کی ہر شے اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو اچھی طرح جانتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کائنات کی ہر شے (اپنی فطری جبلت کی رو سے) جانتی ہے کہ اس کے فرائض منصبی کیا ہیں۔ اسے کس راستے پر چلنا اور کس منزل تک پہنچنا ہے۔ اس کی جدوجہد کے دوائر کون سے ہیں۔ اسی چیز کو ان کی صلوٰۃ اور تسبیح سے تعبیر کیا گیا ہے (تَسْبِیْحٌ کے لئے دیکھئے عنوان س۔ب۔ح)۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کو ان چیزوں کا علم (حیوانات کی طرح) جبلی طور پر نہیں دیا گیا۔ اسے یہ سب کچھ وحی کے ذریعے بتایا گیا ہے۔ جہاں تک اس کی طبعی ضروریات کا تعلق ہے، انسان ان چیزوں کا علم، عقل وفکر اور تجربہ ومشاہدہ

سے حاصل کرسکتا ہے لیکن جہاں تک اس کی ''انسانیت'' کے تقاضوں کا تعلق ہے یہ چیزیں وحی کے ذریعے ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا انسان کو یہ جاننے کے لئے کہ اس کی ''صلوٰۃ و تسبیح'' کیا ہے، وحی کا ماننا اور جاننا ضروری ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے وحی کے دیے ہوئے پروگرام پر عمل کرنا لازمی ہے۔ اسے قرآنِ کریم نے اِقَامَتِ صَلٰوۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ [2:3]۔ یعنی قوانین خداوندی کا اتباع کرنا۔

لیکن وحی کے دئے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا ہونا (اِقَامَتِ صلوٰۃ) انفرادی طور پر ممکن نہیں۔ یہ صرف اجتماعی نظام کے ماتحت ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اس کے لئے جمع کے صیغے استعمال کئے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک اسلامی مملکت کا فریضہ ہی یہ بتایا ہے اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ [22:41] یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے (زَكٰوةٌ کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ز۔ک۔و) اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے''۔ انہی کو دوسری جگہ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ [9:112] کہا ہے یعنی رکوع کرنے والے۔ سجدہ کرنے والے۔ (رُكُوْعٌ اور سَجْدَةٌ کے لئے دیکھئے عنوانات ر۔ک۔ع اور س۔ج۔د)۔ اور یہی وجہ ہے کہ دوسری جگہ اقامت صلوٰۃ اور امور مملکت کے لئے باہمی مشاورت کا اکٹھا ذکر کیا گیا ہے۔ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ [42:38]۔ ''وہ اقامت صلوٰۃ کرتے ہیں اور ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں''۔ اور چونکہ جماعت مومنین کی زندگی کے تمام امور قوانین خداوندی (کتاب اللہ) کے مطابق سرانجام پاتے ہیں اس لئے سورۃ اعراف میں يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ اور اَقَامُوا الصَّلٰوةَ کو ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے [7:170]۔ لہٰذا اقامت صلوٰۃ سے مفہوم ہے ایسا نظام (یا معاشرہ) قائم کرنا جس میں تمام افراد قرآنِ کریم کے قوانین کا اتباع کرتے چلے جائیں اور یوں کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہیں۔ اس مقصد کی مزید وضاحت کے لئے قرآنِ کریم میں صَلّٰی کے مقابلہ میں تَوَلّٰی کا لفظ آیا ہے [75:30-31]۔ تَوَلّٰی کے معنی ہیں صحیح راستہ سے روگردانی کرنا۔ گریز کی راہیں نکالنا' پھر جانا' منہ موڑ لینا۔ اس لئے صَلّٰی کے معنی ہوئے قوانین خداوندی کے مطابق صحیح راستہ پر چلتے جانا۔ نظام خداوندی کے متعین کردہ فرائض منصبی کو ادا کرتے جانا۔ علامہ حمیدالدین فراہیؒ نے اسی اعتبار سے کہا ہے کہ صلوٰۃ کے ایک معنی کسی کی طرف بڑھنے' رخ کرنے اور متوجہ ہونے کے ہیں (مفردات القرآن)۔ سورۃ علق میں ہے اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۝ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝ [96:9-10] یعنی جب خدا کا بندہ اپنے فرائض منصبی کو ادا کرنا چاہتا ہے تو یہ (مخالف) اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتا ہے۔

ان فرائض منصبی کا دائرہ بہت وسیع ہے اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کو یہ محیط نہ ہو۔ چنانچہ سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ سے ان کی قوم نے کہا کہ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا [11:87] ''کیا تیری صلوٰۃ تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں جس کی عبادت ہمارے باپ دادا اختیار کئے چلے آرہے ہیں۔ یا ہم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی مرضی

کے مطابق خرچ نہ کریں''؟ یعنی ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ یہ کیسی صلوٰۃ ہے جو معاشیات تک کو بھی اپنے دائرے کے اندر لے لیتی ہے۔ اس سے بھی صلوٰۃ کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔ یعنی زندگی کے ہر شعبے میں' قوانین خداوندی کے مطابق عمل کرنے کا نام صلوٰۃ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ (تفصیل اس اجمال کی کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو) بات سمٹ سمٹا کر یہاں آجاتی ہے کہ انسان اپنے معاملات کا فیصلہ اپنی مرضی (خواہشات اور جذبات) کے مطابق کرنا چاہتا ہے یا وحیٔ خداوندی کے مطابق؟ اپنے تمام معاملات کو وحیٔ خداوندی کے تابع رکھنے کا نام ''اقامت صلوٰۃ'' ہے۔ چنانچہ سورۃ مریم میں ''اقامت صلوٰۃ'' اور ''اتباع جذبات'' کو ایک دوسرے کے مقابل لا کر اس مفہوم کو واضح کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ.....[19:59] ۔ (انبیائے کرام کے بعد) ''ایسے ناخلف پیدا ہو گئے کہ انہوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور اپنے جذبات وخیالات (اپنی خواہشات) کے پیچھے چلنے لگ گئے''۔ گویا انسان کا اپنی خواہشات کے پیچھے چلنا صلوٰۃ کو ضائع کر دینا ہے اور قوانین خداوندی کے پیچھے چلنا صلوٰۃ کا قائم رکھنا ہے۔ سورۃ انعام میں ''محافظت صلوٰۃ'' کو آخرت اور کتاب اللہ پر ایمان رکھنے کے مرادف قرار دیا گیا ہے [6:93]۔ اسی بنا پر ابن قتیبہ نے الصَّلٰوۃ کے معنی اَلدِّیْنُ کئے ہیں [1]۔ یعنی اقامت صلوٰۃ درحقیقت اقامت دین ہے۔

(6) اَلصَّلٰی کے معنی آگ اور ایندھن کے ہیں۔ اس سے صَلَّی عَصَاہُ عَلَی النَّارِ کے معنی ہیں' اس نے اپنی لکڑی (لاٹھی) کو آگ دکھا کر نرم اور سیدھا کیا۔ سلب ماخذ کے اعتبار سے صَلّٰی کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ اس نے آگ کو ہٹایا اور دور کیا (روح المعانی)۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو صلوٰۃ کے معنی ہوں گے اپنی خامیوں کو رفع کرنا۔ صاحب المنار نے کہا ہے کہ صَلٰوۃ قَولاً و عَمَلاً اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ہم اپنی خامیوں کو رفع کرنے کے لئے' نقائص سے بالاتر ایک ذات (کی راہنمائی) کے محتاج ہیں۔ اسی جہت سے قرطبی نے کہا ہے کہ صلوٰۃ درحقیقت خدا کی محکومیت اور اطاعت کو کہتے ہیں۔

(7) صلوٰۃ کے ایک معنی جھکانا اور کسی کو اپنی طرف مائل کرنا بھی ہیں [2]۔ اس جہت سے صلوٰۃ کا مفہوم ہوگا کائنات کو مسخر کرنا اور اسے اپنے تابع فرمان بنانا۔

(8) الصلوٰۃ کے ایک معنی تعظیم کے بھی ہیں [3]۔ یعنی اپنے عملی پروگرام سے کائنات کو نشوونما دینے والے (رب العالمین) کی عظمت کو ثابت کرنا۔ اس سے اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا باہمی تعلق واضح ہوجاتا ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کے مطابق ایسا پروگرام مرتب کرنا اور اس پر عملاً چلنا جس سے تمام نوع انسان کی نشوونما ہوتی جائے۔

(9) صلوٰۃ کے جو مختلف مفاہیم اوپر بیان ہوئے ہیں' ان سے ظاہر ہے کہ ایک عبد مومن' زندگی کے جس گوشے میں بھی قوانین خداوندی کے مطابق اپنے فرائض منصبی ادا کرتا ہے' وہ فریضہ صلوٰۃ ہی کو ادا کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وقت' مقام یا شکل کا تعین ضروری نہیں۔ لیکن قرآنِ کریم میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں صلوٰۃ کا لفظ ایک خاص قسم کے عمل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً

(ا) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا

[1] القرطبین، جلد اوّل، صفحہ:13، یہ معنی محیط اور اقرب الموارد نے بھی دئے ہیں۔ [2] محیط [3] تاج

وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ [5:6]۔

''اے ایمان والو! جب تم صلوٰۃ کے لئے کھڑے ہو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھولیا کرو۔ اور اپنے سروں کا مسح کرلیا کرو۔ اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھولیا کرو۔'' اس کے بعد ہے کہ اگر تمہیں پانی نہ ملے تو تیمم کرلیا کرو۔

(ب) سورۃ نساء میں ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ [4:43]۔

''اے ایمان والو! تم صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ در آنحالیکہ تم حالت سکر (نشہ یا نیند) میں ہو۔ تا آنکہ تم جو کچھ منہ سے کہو اسے سمجھو (کہ کیا کہہ رہے ہو)''۔ اس کے بعد پھر تیمم کا ذکر ہے۔ (بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں مساجد میں جانے کا ذکر ہے۔ لیکن یہ بحث الگ ہے)۔

(ج) نبی اکرم ﷺ سے ارشاد ہے کہ: وَاِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْیَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْیَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ یُصَلُّوْا فَلْیُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْیَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ [4:102]۔

''اور جب تو ان کے درمیان ہو پھر ان کے لئے قیام صلوٰۃ کرے تو چاہئے کہ ان میں سے ایک گروہ تیرے ساتھ کھڑا ہو اور چاہئے کہ وہ اپنے ہتھیار لے لیں۔ پھر جب وہ سجدہ کرچکیں تو وہ تمہارے پیچھے ہو جائیں اور چاہئے کہ دوسرا گروہ جنہوں نے صلوٰۃ ادا نہیں کی وہ تیرے ساتھ صلوٰۃ ادا کریں۔ اور وہ اپنے بچاؤ (کا سامان) اور اپنے ہتھیار لئے رہیں''۔ اس کے بعد ہے فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ .....[4:103] ''پھر جب تم صلوٰۃ ادا کر چکو تو کھڑے، بیٹھے، لیٹے جس طرح جی چاہے اللہ کا ذکر کرو۔ پھر جب تم اطمینان کی حالت میں ہو تو قیام صلوٰۃ کرو''۔

اس سے پہلی آیت یہ ہے وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا..... [4:101] ''اور جب تم زمین میں سفر کرو تو اس میں تمہارے لئے حرج کی بات نہیں کہ تم صلوٰۃ کو کم کرلو اگر تمہیں ڈر ہو کہ کفار (مخالفین) تمہیں تکلیف پہنچائیں گے''۔ اس ضمن میں [2:239] بھی دیکھئے۔

صلوٰۃ کے کم کرنے کا طریق [4:102] میں بیان ہو چکا ہے۔

(د) سورۃ مائدۃ میں ہے وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا..... [5:58] ''اور جب تم صلوٰۃ کے لئے آواز دیتے ہو تو (مخالفین) اسے ہنسی اور مذاق (کھیل) بنا لیتے ہیں''۔ سورۃ الجمعہ میں ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ .....[62:9-10]۔ ''جب جمعہ کے دن (یا اجتماع کے وقت) صلوٰۃ کے لئے بلایا جائے تو ''اللہ کے ذکر'' کی طرف جلدی آجایا کرو اور کاروبار کو چھوڑ دیا کرو۔ اگر تمہیں (اس کی اہمیت کا) علم ہو (تو تم اس حقیقت کو محسوس کرلو گے

کہ) یہ تمہارے لئے (کس قدر) بہتر ہے۔ پھر جب صلوٰۃ ختم ہو جائے تو تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کو تلاش کرو اور ''اللہ کا بہت ذکر کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ''۔ اس کے بعد ہے کہ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ انہیں جب کاروبار یا کھیل تماشا نظر آ جاتا ہے تو اس کی طرف بھاگ جاتے ہیں اور تجھے کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔ ان سے کہو کہ جو کچھ اللہ کے ہاں سے تمہیں مل سکتا ہے وہ کھیل اور کاروبار سے کہیں بہتر ہے اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے [62:11]۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم میں صلوٰۃ کا لفظ ان اجتماعات کے لیے بھی آیا ہے جنہیں عام طور پر نماز کے اجتماعات کہا جاتا ہے۔ (نماز کا لفظ عربی زبان کا نہیں' پہلوی زبان کا ہے)۔ ان اجتماعات کے سلسلہ میں ایک بات خاص طور پر سمجھنے کے قابل ہے۔ جیسا کہ (ع۔ب۔د) کے عنوان میں وضاحت سے بتایا جائے گا' قرآنِ کریم کی رو سے ''خدا کی عبادت'' سے مفہوم اس قسم کی ''پرستش'' یا ''پوجا پاٹ'' نہیں جو عام طور پر اہل مذاہب کے ہاں پائی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے ''عبادت'' کا مفہوم خدا کے قوانین و احکام کی اطاعت یا ''اللہ کی محکومیت اختیار کرنا ہے''۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی یہ محکومیت' زندگی کے ہر سانس اور کاروبارِ حیات کے ہر شعبہ میں اختیار کی جائے گی۔ اس کی عملی شکل وہ نظام مملکت ہے جو قرآنی اصولوں کے مطابق متشکل کیا جاتا ہے۔ اسی نظام کے حاملین کے متعلق فرمایا وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ [42:38] ''یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے نشوونما دینے والے کی اطاعت کرتے ہیں اور اقامت صلوٰۃ کرتے ہیں۔ اور ان کا معاملہ باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے۔ اور جو کچھ ہم انہیں دیتے ہیں وہ اسے (نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے) کھلا رکھتے ہیں''۔ ان آیات میں' اطاعت خداوندی' اقامت صلوٰۃ اور امور مملکت کے طے کرنے کے لئے باہمی مشاورت کا ارتباط غور طلب ہے۔ ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی کے نفاذ کے متعلق ضروری امور کا فیصلہ کرنے کے لئے باہمی مشاورت کی ضرورت ہوگی' اور مشاورت کے لئے اجتماعات بھی ضروری ہوں گے۔ وسیع معنوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ اجتماعات بجائے خویش ''اقامت صلوٰۃ'' ہی کا ایک حصہ ہوں گے لیکن ان اجتماعات میں ایک اَور حقیقت کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جیسا کہ (ر۔ک۔ع) اور (س۔ج۔د) کے عنوانات میں لکھا جا چکا ہے' انسان اپنے جذبات کا اظہار جسم کے اعضا کی محسوس حرکات سے بھی کرتا ہے' اور یہ چیز اس میں ایسی راسخ ہو چکی ہے کہ اس سے یہ حرکات خود بخود سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ غم و غصہ' خوشی' تعجب' عزم و ارادہ' ہاں اور نہ' وغیرہ قسم کے جذبات اور فیصلوں کا اظہار' انسان کی طبعی حرکات سے بلا ساختہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت جذبات عزت و احترام اور اطاعت و انقیاد کے اظہار کی ہے۔ تعظیم کے لئے انسان کا سر بلا اختیار نیچے جھک جاتا ہے۔ اطاعت کے لئے ''سر تسلیم خم'' ہو جاتا ہے۔ اگرچہ قرآنِ کریم عمل کی روح اور حقیقت پر نگاہ رکھتا ہے اور محض (Formalism) کو کوئی وزن نہیں دیتا' لیکن جہاں کسی جذبہ کی روح اور حقیقت کے اظہار کے لئے (Form) کی ضرورت ہو' اس سے روکتا بھی نہیں' بشرطیکہ اس (Form) ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لیا جائے۔ صلوٰۃ کے سلسلہ میں قیام و سجدہ وغیرہ کی جو عملی شکل ہمارے سامنے آئی ہے' وہ اسی

مقصد کے لئے ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ان جذبات کا اظہار، اجتماعی شکل میں ہو، تو اظہار جذبات کی محسوس حرکات میں ہم آہنگی کا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے ورنہ اجتماع میں انتشار ابھرتا دکھائی دے گا۔ احترام وعظمت، انقیاد واطاعت اور فرماں پذیری وخود سپردگی کے والہانہ جذبات کے اظہار میں نظم وضبط کا ملحوظ رکھنا، بجائے خویش بہت بڑی تربیت نفس ہے۔ یہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ:

بے قراری ہے کس قرار کے ساتھ
جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

یہ ہے جذبات اطاعت وتسلیم کے اظہار کی وہ منضبط شکل (صلوٰۃ) جسے قرآنِ کریم، جماعتِ مومنین کی مجالس و مشاورت کا ضروری حصہ قرار دیتا ہے۔ (جس طرح آج کل ہمارے ہاں جلسوں کی کارروائی کا آغاز تلاوت قرآنِ کریم سے کیا جاتا ہے اگرچہ یہ چیز محض رسماً ادا کر دی جاتی ہے)۔ (وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ)۔ ان اجتماعات کی اہمیت کے پیش نظر، قرآنِ کریم نے انہیں كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا [4:103] کہا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں ''خاص طور پر مقرر کردہ فریضہ''۔ اور دوسرے معنی ہیں ''ایسا فریضہ جو وقت پر ادا کیا جاتا ہے''۔ اجتماعات کے لئے وقت کی پابندی جس قدر ضروری ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی لئے سورۃ الجمعہ کی جو آیت پہلے درج کی جا چکی ہے، اس میں خاص طور پر کہا گیا ہے کہ جب اس اجتماع کے لئے بلایا جائے، تو اسے تمام دیگر مصروفیات پر ترجیح دو۔ تمام کاروبار چھوڑ کر فوراً اس طرف آجاؤ اور جب تک اس سے فارغ نہ ہو جاؤ کسی اور کام کی طرف دھیان مت دو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا امیر، تمہارے سامنے ضروری معاملات پیش کر رہا ہو، ان کی اہمیت سمجھا رہا ہو اور تم کاروبار کے لئے باہر نکل جاؤ۔ (وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا)۔

یوں تو جماعت مومنین کی ساری زندگی، دن رات، صبح شام، قوانین خداوندی کی اطاعت اور ان کے نفاذ کی تگ و تاز میں گزرتی ہے، لیکن اجتماعات کے لئے خاص اوقات کا تعین ضروری ہوتا ہے۔ خواہ یہ اجتماعات معمولاً منعقد ہوں یا ہنگامی طور پر بلائے جائیں۔ ذہن انسانی کی توہم پرستیوں نے، جہاں زندگی کے اور گوشوں میں ''سعد ونحس'' کے افسانے تراشے تھے وہاں دن اور رات کے بعض اوقات کے لئے بھی اسی قسم کے تصور قائم کر رکھے تھے۔ سورج نکلتے وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہئے زوال کے وقت یوں نہیں کرنا چاہئے۔ دن اور رات کے ملتے وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ قرآنِ کریم نے جہاں اور توہم پرستیوں کا خاتمہ کر دیا وہاں اوقات کے سلسلہ میں بھی یہ کہہ کر بات واضح کر دی ہے کہ دن اور رات میں نہ کوئی ساعت نحس ہے نہ سعد۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فلاں وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہئے۔ جہاں تک اجتماعات صلوٰۃ کا تعلق ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ..... [17:78] تم ''دلوک الشمس'' سے رات کی تاریکی تک اقامت الصلوٰۃ کر سکتے ہو اور صبح کے وقت کا قرآن بھی۔ (د۔ل۔ک) کے عنوان میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ ''دلوک'' میں، صبح سے شام تک کا سارا وقت آجاتا ہے، بالخصوص جب سورج کے بلند ہونے، نصف النہار تک پہنچنے، مائل بہ زوال ہونے اور غروب ہو جانے کی مختلف منازل کو (خاص طور پر) اس میں شامل کرنا مقصود ہو۔ ان مختلف منازل کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود ان توہم پرستوں کی تردید تھا جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ انہی کی طرف ان آیات میں

اشارہ کیا گیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ [11:114] ''دن کے دونوں اطراف اور رات کے حصوں میں اقامت صلوٰۃ کرو''۔

ان اوقات کا ذکر تو خصوصیت سے لفظ صلوٰۃ کے ساتھ کیا گیا ہے' ویسے اقامت دین کے سلسلہ میں جماعت مومنین کی تگ و تاز کے سلسلہ میں (جسے قرآنِ کریم تسبیح' تحمید و تذکیر کے اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے) دن' رات کے تمام اوقات کا ذکر آیا ہے۔ دیکھئے [3:190]' [20:130]' [50:39]' [52:49] وغیرہ۔

سورۃ نور میں صلوٰۃ الفجر اور صلوٰۃ العشاء کا ذکر ضمناً) آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ تمہارے گھر کے ملازمین کو چاہئے کہ وہ تمہاری (Privacy) کے اوقات میں' اجازت لے کر کمرے کے اندر آیا کریں۔ یعنی مِنۡ قَبۡلِ صَلٰوۃِ الۡفَجۡرِ وَحِیۡنَ تَضَعُوۡنَ ثِیَابَکُمۡ مِّنَ الظَّہِیۡرَۃِ وَمِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوۃِ الۡعِشَآءِ [24:58] ''صلوٰۃ الفجر سے پہلے اور جب تم دوپہر کو کپڑے اتار دیتے ہو اور صلوٰۃ العشاء کے بعد''۔ اس سے واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اجتماعات صلوٰۃ کے لئے (کم از کم) یہ دو اوقات متعین تھے۔ جبھی تو قرآنِ کریم نے ان کا ذکر نام لے کر کیا ہے۔

جہاں تک صلوٰۃ میں کچھ پڑھنے کا تعلق ہے' یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم کیا پڑھ رہے ہو [4:43]۔ دوسرے مقام میں ہے وَلَا تَجۡہَرۡ بِصَلَاتِکَ وَلَا تُخَافِتۡ بِہَا وَابۡتَغِ بَیۡنَ ذٰلِکَ سَبِیۡلًا [17:110] ''اور اپنی صلوٰۃ کو نہ تو بلند آواز سے ادا کر اور نہ خاموشی سے۔ ان دونوں کے درمیان راستہ اختیار کر''۔ بعض لوگوں کا خیال ہے اس آیت میں صلوٰۃ سے مراد عام دعا یا ذکر ہے' نماز نہیں۔ لیکن یہ خیال صحیح نظر نہیں آتا۔ ''ذکر'' کے متعلق قرآنِ کریم میں بہ صراحت موجود ہے [7:205] کہ اسے خاموشی سے دل میں کرنا چاہئے۔ بہ آواز بلند نہیں (ذکر سے مراد' قانون خداوندی کی یاد ہے) اس لئے مندرجہ بالا آیت میں صلوٰۃ سے مراد ''نماز'' ہی ہو سکتی ہے۔ قرطبی نے اس کے معنی قرأت لکھے ہیں۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ ان مقامات میں صلوٰۃ سے مراد اجتماعات صلوٰۃ ہیں (اس کے لئے فعل صَلّٰی۔ یُصَلِّی آتا ہے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں ''اقیموا الصلوٰۃ'' کہا ہے وہاں' بہ ہیئت مجموعی' اس سے مراد ہے' اقامت دین (یعنی نظامِ خداوندی کی تشکیل و استحکام)' قوانین و احکام خداوندی کا تباع۔ ان فرائض منصبی کی ادائیگی جو ایک عبد مومن پر عائد ہوتے ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر اس سے مراد ہیں اجتماعات صلوٰۃ جو خود دین کے نظام کا جزو ہیں۔ متعلقہ مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ وہاں اقامت صلوٰۃ سے مقصود کیا ہے۔ اسی طرح جہاں جہاں ''مصلین'' آیا ہے وہاں بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ اس سے مراد جماعت مومنین (بہ ہیئت مجموعی) ہے یا صرف اجتماعات صلوٰۃ میں شرکت کرنے والے۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم نے ان ''مصلین'' کا بھی ذکر کیا ہے جو شرف انسانیت کی بلندیوں پر ہیں (دیکھئے 70:22-35) اور ان کا بھی جن کے لئے تباہی ہے (107:4-7)۔

(10) صَلّٰی عَلَیۡہِ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں تعظیم کرنا' دعا دینا' حوصلہ افزائی کرنا' پروان چڑھانا' نشوونما دینا' کسی قسم کی خرابی یا فساد پیدا نہ ہونے دینا[1]۔

ان معانی کو سامنے رکھنے سے قرآنِ کریم کے ان

مقامات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جن میں یہ مادہ علیٰ کے صلہ کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً سورۃ احزاب میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُهٗ..... [33:43] ''خدا اور اس کے ملائکہ (کائناتی قوتیں) تمہاری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ تمہاری نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ تمہاری کوششوں کو پروان چڑھاتے ہیں۔'' یہ ان مومنین کے متعلق ہے جن کی بابت دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ جب انہیں اقامت دین کے سلسلہ میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ ان سے گھبراتے نہیں' حوصلہ نہیں ہارتے' بلکہ ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ [2:157] یہ لوگ خدا کے نزدیک مستحق تبریک و تہنیت ہیں۔ انہیں خدائی تائید و نصرت حاصل ہے۔ خدا ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ان کی کوششوں کو کامیاب بناتا ہے۔ ان کی نشوونما کرتا ہے یہ تو رہا عام جماعت مومنین کے متعلق' خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ... خدا اور اس کے ملائکہ نبی ﷺ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ اس کے بعد ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا [33:56] ''اے جماعت مومنین! تم بھی اپنے نبی ﷺ کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں اس کا ساتھ دو۔ اس کی کوششوں کو پروان چڑھانے میں اس کی مدد کرو۔ اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ اس کی پوری پوری اطاعت کرو'' [4:65]۔ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ [48:9] (تاکہ) تم اس کی مدد کرو۔ اس کی عزت و توقیر کرو۔ مومنین کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے۔ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ [7:157] ''جنہوں نے اس کی تائید و تعظیم کی' اس کی مدد کی''۔ اس طرح کہ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ [7:157] ''جو روشن (کتاب) ہم نے اس کے ساتھ نازل کی ہے اس کا اتباع کیا''۔ یہ ہے مومنین کی طرف سے صَلُّوْا عَلَیْهِ کے فریضہ کی ادائیگی کا طریق۔

یہ ہے خدا اور اس کے ملائکہ کے صَلٰوتٌ جماعت مومنین پر اور خود نبی اکرم ﷺ پر اور یہ ہے جماعت مومنین کا صلوٰۃ و سلام نبی اکرم ﷺ پر۔ آپ نے غور فرمایا کہ صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا کا حکم کتنے عظیم عملی پروگرام کا متقاضی ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت سے اس دین کو تمام ادیان عالم پر غالب کرنا جسے نبی اکرم ﷺ لے کر تشریف لائے تھے۔ دوسری طرف نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ جب جماعت مومنین کے افراد' انفاق فی سبیل اللہ کے لئے تیرے پاس اپنی کمائی لے کر آئیں تو اسے قبول کر' وَصَلِّ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ [9:103] اور ان کی حوصلہ افزائی کر۔ اس لئے کہ تیری طرف سے حوصلہ افزائی (Encouragement)' تحسین و تبریک (Appreciation) ان کے لئے موجب تسکین ہوتی ہے۔ وہ اس انفاق فی سبیل اللہ کو قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ [9:99] کا موجب سمجھتے ہیں۔ یعنی قرب خداوندی کا باعث اور رسول اللہ کی طرف سے تحسین و تبریک اور حوصلہ افزائی کا موجب۔ (''قرب خداوندی'' کے لئے ق۔ر۔ب کا عنوان دیکھئے)۔

(11) لغت عبرانی میں صَلٰوتٌ یہودیوں کی عبادت گاہوں کو بھی کہتے ہیں۔ [22:40] میں یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے۔

محمد طاہر بٹ (سیالکوٹ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ہمیں کیسا پاکستان چاہئے!

وہ خطۂ سرزمین جسے 14 اگست 1947ء کو پاکستان کہلانے کا فخر حاصل ہوا اللہ تعالیٰ کے کرم، قائداعظمؒ کی ولولہ انگیز قیادت اور برصغیر جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کے جذبۂ حریت، ایثار و قربانی اور وحدت فکر و عمل کا ایک عظیم اور تاریخی انعام ہے۔

پاکستان کا قیام مسلمانانِ برصغیر کی عظیم انقلابی تحریک کی اہم منزل تھی جسے حاصل کرنے کے بعد ایک نئے سفر کا آغاز ہوا۔ وطن عزیز کو نظریۂ پاکستان کے مطابق ایک ترقی یافتہ اور خوشحال مملکت بنانے کا سفر۔ لیکن اس سفر میں ہمارے ہمسفر کچھ سامری بھی تھے جن کی تعداد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھتی چلی گئی ہے۔ یہ وہی سامری ہیں جب حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو لے کر الگ خطۂ ارض پر جا بسے تو سامری بھی ہمراہ چلا آیا اور قوم کو حضرت موسیٰؑ کی غیر موجودگی میں گمراہ کرتا رہا۔ وہ ایک سامری تھا یہاں قائداعظمؒ جب آئے تو کئی سامری بھیس بدل کر ہمراہ چلے آئے اور آج تک قوم کو گمراہ کر رہے ہیں اور شاید اسی لئے منزل سامنے نظر نہیں آتی اور ہم بھٹکتے جا رہے ہیں۔ نصف صدی گزر چکی اور اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اپنے ماضی کا جائزہ لیتے ہوئے حال کو سمجھیں تاکہ مستقبل کا فیصلہ کیا جا سکے کہ ''ہمیں کیسا پاکستان چاہئے؟'' اور ہماری منزل کون سی ہے؟ اور اب ہمیں کس ہمسفر کے ساتھ کون سے راستے پر سفر کرنا ہے؟

ماضی

☆ 1685ء میں سیواجی کے سپوت سنبھاجی بولے ''مسلمان ملیچھوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر صاف کر دو''۔

(تاریخ مہاراشٹر، بھائی پرمانند)

☆ ٹیپو سلطان جیسا مردِ مجاہد جب وطن کو انگریز سے آزاد کروانے کی جدوجہد کر رہا تھا (1782ء تا 1799ء) ہندو اس سے لڑتے رہے اور غدارِ ملت میر صادق کو ابھار کر مسلمانوں کی امیدوں کی ایک اور شمع کو گل کر دیا۔

☆ مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے والا اور ان کی عورتوں کو بے حرمت کرنے والا سیدھا سورگ (جنت) میں جائے گا۔ (لالہ دھنپت رائے)

☆ پوری قوم کو جل جانے دو ہم پاکستان کے نام پر ایک انچ زمین نہیں دیں گے۔ (گاندھی)

☆ 1938ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی سربراہی میں اور ابوالکلام آزاد کی سرپرستی میں نئی تعلیمی پالیسی ''واردھا اسکیم'' بنائی گئی۔ اس اسکیم میں یہ کہا گیا کہ مذہب سب برابر ہیں۔ ''بچوں کو آپ پڑھا نہیں سکتے کہ اسلام دین حق ہے''۔ (کچھ غیرت مند مسلمانوں کی وجہ سے یہ واردھا اسکیم آگے نہ بڑھ سکی۔)

☆ پاکستان کا قیام ایک عارضی حادثہ ہے۔ پاکستان کو مٹا دینے کے لئے 30 کروڑ ہندوؤں کو جان بھی دینی پڑے تو اس کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ (دیوان چمن لال)

☆ 1947ء میں پاکستان وجود میں آیا تو رام راج کے پجاریوں نے 10 لاکھ مسلمانوں کو شہید کر ڈالا' ان کے محلے کے محلے جلا دیئے گئے' لاتعداد خواتین کو بے حرمت کیا گیا اور اغوا کیا گیا۔ مکان' دکانیں' ٹرینیں لوٹی گئیں۔ پانی میں نیلا تھوتھا کا زہر ملایا گیا۔ مسلمان زندہ جلائے گئے۔ ان کے اعضاء قطع کئے گئے' بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا۔ ہزاروں مسجدوں کو مندروں اور گردواروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ حاملہ خواتین کے پیٹ چاک کر کے جنین تک قتل کئے گئے۔ خود بھارتی حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق 1947ء سے آج تک ملک میں دس ہزار سے زیادہ بلوے مسلمانوں کے خلاف ہو چکے ہیں۔ (کمال یہ ہے کہ کسی ہندو کو ان بلووں کی پاداش میں سزا نہیں دی گئی) دنیا کی تاریخ میں ایسی اندھیر نگری کسی قوم نے نہیں مچائی۔

☆ ''ہندوستان' نظریئے اور عمل دونوں اعتبار سے ایک ہندو اسٹیٹ ہوگی۔ جس کا مذہب ہندو ہو' کلچر ہندو ہو اور حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو''۔ (ڈاکٹر رادھا مکرجی' نائب صدر ہندو مہاسبھا 1938ء)

☆ ''اذان اور نماز کے وقت مسجد کے آگے باجا بجانا ہر ہندو کے دھرم کا حصہ ہونا چاہئے۔''

(لالہ ہردیال 1925ء)

☆ بھارت ماتا کے مسلمانوں کا ایک ہی مستقبل ہے کہ وہ دوبارہ ہندو ہو جائیں۔ ایک اور مستقبل بھی ہے کہ انہیں مٹی میں دبا دیا جائے''۔ (مہاشہ کرشن: اخبار پرتاب 1930ء)

☆ ''پاکستان کی اسلامی حکومت میں اطاعت صرف اللہ کی ہوگی یعنی قرآن کے اصولوں اور احکام کی۔ اسلام میں درحقیقت نہ کسی بادشاہ یا ڈکٹیٹر کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی نہ کسی اور شخص یا ادارے کی۔ اسلامی حکومت قرآنی اصولوں اور احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔''

(قائداعظمؒ 1941ء عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے طلباء سے خطاب)

☆ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بستی بلکہ مسلمان اور ہندو دو جداگانہ قومیں بستی ہیں (سرسید احمد خانؒ 1865ء)

☆ ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں میں ان کی آزاد حکومت قائم ہونی چاہئے۔

(علامہ اقبالؒ اجلاس الہٰ آباد 1930ء)

☆ تحریک پاکستان کے متعلق نیشنلسٹ علماء ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی، مودودی، مجلس احرار، سرخپوش، خان عبدالغفار وغیرہ کا کہنا تھا کہ ہندو ہمیں نماز روزے سے نہیں روکتا تو ہمیں پاکستان کی کیا ضرورت ہے؟

اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے ارشاد فرمایا:

مُلا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

☆ ہمارا کوئی دوست نہیں ہے۔ ہمیں نہ انگریزوں پر بھروسہ ہے نہ ہندو بنئے پر، ہم دونوں کے خلاف جنگ کریں گے خواہ وہ آپس میں متحد کیوں نہ ہو جائیں۔ (قائداعظمؒ، اجلاس عام پشاور 2 نومبر 1945ء)

☆ ''ہمیں جو دکھ دیا گیا ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ مگر ہمیں پاکستان کو قائم رکھنے کے لئے ابھی اور قربانیاں دینا ہوں گی۔ مسلمان مصیبت میں گھبرایا نہیں کرتا۔ ہمارے حوصلے بلند ہیں۔ اگر اسی طرح تمام ملت ہمت اور صبر کے ساتھ کام کرتی رہی تو ہماری مصیبتیں انشاء اللہ بہت جلد ختم ہو جائیں گی۔''

(قائداعظمؒ، لاہور 30 اکتوبر 1948ء)

☆ خدا کی قسم، جب تک ہمارے دشمن ہمیں اٹھا کر بحیرۂ عرب میں نہ پھینک دیں، ہم ہار نہ مانیں گے۔ پاکستان کی حفاظت کے لئے میں تنہا لڑوں گا، اس وقت تک لڑوں گا جب تک میرے ہاتھوں میں سکت اور میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے۔ مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ اگر کبھی کوئی ایسا وقت آ جائے کہ پاکستان کی حفاظت کے لئے جنگ لڑنی پڑے تو کسی صورت میں ہتھیار نہ ڈالیں اور پہاڑوں میں، جنگلوں میں، میدانوں میں اور دریاؤں میں جنگ جاری رکھیں۔

(فرمان قائداعظمؒ: بحوالہ سردار عبدالرب نشتر)

☆ خدا نے ہمیں یہ سنہری موقع عطا کیا ہے کہ ہم ثابت کر دکھائیں کہ ہم واقعی ایک نئی مملکت کے معمار ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ خدارا، کہیں لوگ ہمارے متعلق یہ نہ کہیں کہ ہم یہ بار اٹھانے کے قابل ہی نہ تھے۔

(قائداعظمؒ: افواج پاکستان کے افسروں سے خطاب، کراچی 11 اکتوبر 1947ء)

☆ اس مشینی زمانے میں جبکہ انسان کی گمراہ کن ذہانت تباہی و بربادی کے نئے نئے انجن ہر روز ایجاد کرتی رہتی ہے' آپ کو زمانے کے مطابق چلنا پڑے گا اور اپنے علم' ساز و سامان اور اسلحے کو جدید ٹیکنیکوں کے مطابق رکھنا پڑے گا۔ اس لئے نہیں کہ ہم اپنے کسی پڑوسی کے خلاف بری نیت رکھتے ہیں' بلکہ اس لئے کہ ہماری سلامتی کا یہ بنیادی تقاضا ہے کہ ہم کمزور نہ رہیں' ہم پر کوئی اچانک حملہ نہ کر سکے۔ اس سے زیادہ ہماری کوئی خواہش نہیں ہے کہ ہم امن و امان کے ساتھ رہیں' دوسروں کو امن و امان سے رہنے دیں اور بیرونی مداخلت کے بغیر اپنے نقطہ نظر کے مطابق اپنے ملک کو ترقی دیں اور عام انسان کی زندگی کو بہتر سے بہتر بنائیں۔ بے شک یہ بہت مشکل اور کٹھن کام ہے لیکن اگر ہم شوق اور خلوص سے کام کرنے کا عزم کر لیں اگر ہم اپنی قوم کے اجتماعی مفاد کی خاطر بڑی سے بڑی قربانیاں دینے کے لئے تیار رہیں تو ہم اپنا نصب العین بہت جلد حاصل کر لیں گے۔

(قائداعظمؒ: بری فوج کے جوانوں سے خطاب' 21 فروری 1948ء)

☆ کشمیر سیاسی اور فوجی اعتبار سے پاکستان کی شہ رگ ہے۔ کوئی خوددار ملک اور قوم یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اپنی شہ رگ کو دشمن کی تلوار کے حوالے کر دے۔ (قائداعظمؒ: وفات سے چند روز قبل)

☆ 28 مئی 1998ء قائداعظمؒ کے فرمان کی تعبیر کے مطابق پاکستان ایٹمی طاقت بن گیا۔

☆ ''میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں'' (وزیراعظم میاں محمد نواز شریف)

حال

☆ دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان بستے ہیں اور ان پر ظلم و ستم کیا جا رہا ہے تو کیا پاکستان ان کی حمایت یا مدد سے گریز تو نہیں کر رہا؟

☆ ڈاکٹر ذاکر حسین کی سربراہی میں اور ابوالکلام آزاد کی سرپرستی میں نئی تعلیمی پالیسی ''وارد ھا اسکیم'' بنائی گئی تو کیا اب بھی پاکستان میں کسی دوسری قوم کو خوش کرنے کے لئے تعلیمی پالیسی تبدیل تو نہیں کی جا رہی؟

☆ دیوان چمن لال کا بیان کہ ''پاکستان کا قیام ایک عارضی حادثہ ہے''۔

کیا ہمارا آج کا عمل اس کو سچ ثابت کرنے میں مدد تو نہیں کر رہا؟

☆ ''بھارت ماتا کے مسلمانوں کا ایک ہی مستقبل ہے کہ دوبارہ ہندو ہو جائیں''۔

کیا ہندوستان میں موجود مسلمانوں کے ساتھ پاکستان کے مسلمانوں کو بھی ہندو تو نہیں ہونا پڑے گا؟

☆ ''پاکستان کی اسلامی حکومت میں اطاعت صرف اللہ کی ہوگی یعنی قرآن کے اصولوں اور احکام کی''۔ (قائداعظمؒ)

کیا پاکستان میں اطاعت اللہ کے سوا کسی اور کی تو نہیں؟ کیا پاکستان کے حکمران بھی اللہ کے احکامات کی بجائے کسی نہ کسی بیرونی طاقت کے احکامات کے تابع تو نہیں؟

☆ پاکستان بنانے کی کیا ضرورت ہے؟

کیا علماء پاکستان بننے کے بعد بھی اس بات کو سمجھ سکے ہیں یا نہیں؟

☆ ہمارا کوئی دوست نہیں ہے۔ ہمیں نہ انگریزوں پر بھروسہ ہے نہ ہندو بنئے پر۔ (قائداعظمؒ)

کیا آج ہم کسی ایسے ہی دشمن کو دوست تو نہیں بنا رہے جو دوست بن کر آستین کے سانپ کا کردار ادا کرے؟

☆ کیا آج کے ہمارے عمل سے بزرگوں کی دی گئی قربانیاں رائیگاں تو نہیں ہو رہیں؟

☆ کیا پاکستان کی حفاظت کی بجائے اپنی ذاتی حفاظت کے پیش نظر ایک دفعہ پھر بغیر لڑے جنگ تو نہیں ہاری جا رہی؟

☆ کیا ہم اپنی شہ رگ کو ہندو رام راج کی میٹھی چھری کے حوالے کر کے اس قربانی کے بکرے کی طرح تو نہیں کر رہے جو قربان ہو جاتا ہے اور احتجاج بھی نہیں کرتا؟

☆ کیا ہم اپنی حفاظت کرنے والی ایٹمی طاقت کو بکنے والی چیز تو نہیں سمجھ رہے؟

☆ کیا اپنے وطن کی حفاظت کرنے والی اسلام کا سر بلند رکھنے والی تلوار' طاؤس و رباب کے نشے میں زنگ آلود تو نہیں ہو رہی؟

☆ کیا پاکستان کے حالات پاکستان بننے سے پہلے جیسے تو نہیں ہو رہے؟

مستقبل

آج پاکستان اور عالم اسلام ایسے مقام پر کھڑے ہیں کہ پوری امت مسلمہ کے ہاتھ اللہ کی جانب اٹھے ہوئے ہیں اور حسرت بھری نظریں اسلام کے قلعہ پاکستان کی جانب دیکھ رہی ہیں۔ شاید یہ کہتے ہوئے کہ کون سی جماعت مومنین ہے جو اللہ سے کئے وعدے کو یاد کرے گی اور پورا کرنے کے لئے میدان میں آئے گی۔

اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہمیں من حیث القوم سوچنا ہوگا کہ ہمارا مستقبل کیا ہے؟ ماضی کو یاد کرتے ہوئے ہمارا حال ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہمیں کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے کی بجائے کوئی اور لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا وگرنہ (خاکم بدہن) ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔

ہمیں اپنے مستقبل کے لئے فیصلہ کرنا ہوگا کہ ''ہمیں کیسا پاکستان چاہئے؟''۔

وسیم احمد یزدانی، ایبٹ آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانم آرزوست

جہانی تیرہ تر با آفتابی صواب او سراپا نا صوابی
ندانم تا کجا ویرانہ ئے را دہی از خون آدم رنگ و آبی
(ارمغان حجاز)

یہ جہان سورج یعنی قرآن مجید سے روشن ہونے کی بجائے اور تاریک ہو گیا ہے۔ اہل دنیا اس کلام پاک سے استفادہ نہیں کر رہے۔ یہ خود کو راہ راست پر سمجھ رہے ہیں مگر حقیقت میں گمراہ ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اس کی خوبیاں بھی برائیاں لگ رہی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ تو کب تک ایک ویرانے کو آدمی کے خون سے چمک دمک دیتا رہے گا۔ اس ویرانے کی بجائے دوسری دنیا پیدا کر جس میں ایسے لوگ آباد ہوں جو قرآن کے قوانین پر چلیں۔

عزیزانِ گرامی قدر! اگر ہم اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو ہمیں ہر طرف ظلم ناانصافی لوٹ کھسوٹ، جبر، غلامی، عدم مساوات، حق تلفی، جھوٹ، منافقت، دغابازی اور اس ہی قسم کی دیگر بیماریاں اور عوارض بکثرت نظر آتے ہیں جو کسی بھی انسانی معاشرے کا زوال ہوتے ہیں۔ اور صدیوں سے انسانی عقل ان ہی مسائل کا حل ڈھونڈتی نظر آتی ہے۔ مگر انسانی عقل نے آج تک جتنے بھی حل تلاش کیئے وہ سب عارضی ثابت ہوئے ان میں سے کوئی حل دیرپا ثابت نہیں ہوا، اگر آج کسی نظریہ نے جنم لیا تو کچھ ہی عرصہ بعد ردعمل کے طور پر ایک نیا نظریہ سر ابھارنے لگتا ہے جو کہ پہلے نظریہ کی ضد ہوتا ہے اور اسی طرح یہ انسانی قافلہ منزلوں پر منزلیں طے کیئے چلا جا رہا ہے، مگر آج تک کسی منزل پر پڑاؤ نہیں کر سکا۔ عقل انسانی نے جہاں غاروں سے نکل کر مکانوں میں رہنا سیکھا، جانوروں کے شکار سے آگے بڑھ کر کھیتی اگانا سیکھی پتھروں اور لکڑیوں کے اوزاروں سے دھات کے اوزار بنانے شروع کیئے بابل کے معلق باغات سے، مصر کے بلند و بالا احرام تخلیق کرنا شروع کیئے، ہاتھی اور اونٹ جیسے بڑے اور مہیب جانوروں کو اپنا تابع فرمان بنایا۔ مگر عقل انسانی ہنوز عالم سفر میں ہی رہی اور ایک مثالی انسانی معاشرہ تشکیل دینے میں سراسر ناکام رہی۔

ارسطو اور افلاطون جیسے فلاسفروں کے تصور ریاست میں غلامی کو جائز قرار دیا گیا زرتشت نے دو خداؤں اہرمن اور یزداں کا تصور دیا، یعنی ایک خدا نیکی کا اور ایک خدا بدی کا گوتم بدھ نے انسانی تکالیف اور مصائب کو محسوس کرتے ہوئے محلات کی پر آسائش زندگی چھوڑی اور برہمنیت کے خلاف وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں غور و فکر کرنے تو گیا مگر حقیقت کو وہ نہ

پا سکا۔ یہ انسانی عقل کا ارتقاء تھا اور انسانی مصائب کا حل تلاش کرتے ہوئے اسے زمانے گزر گئے۔

نقش گرِ ازل! ترا نقش ہے نا تمام ابھی
عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی
(بال جبریل)

نقش گر کا نقش ابھی نا تمام ہے۔ کیوں کہ عقل بے لگام ہے، عشق یعنی وحی کو ابھی تک حضرت آدم نے وہ مقام نہیں دیا جس کی وہ اہل ہے۔ وہ ہنوز عقل ہی کو اپنا راہنما بنائے ہوئے آگے بڑھنے کی جستجو میں ہے۔ مگر ٹھوکروں پہ ٹھوکریں کھائے چلا جا رہا ہے۔ خالق کائنات نے آدم کو تخلیق کے بعد تنہا نہیں چھوڑا بلکہ وحی کے ذریعہ راہنمائی کا ایک راستہ کھلا رکھا تاکہ انسانیت بھٹکنے نہ پائے۔ اور بھٹکے ہوئے انسانوں کو راہ دکھائے کہ کسی طرح لوٹ کھسوٹ اور ظلم و ناانصافی سے پاک ایک معاشرہ تشکیل پا سکے۔ ایک ایسا معاشرہ جو طبقات میں تقسیم نہ ہو، جہاں ظلم و ناانصافی نہ ہو، جب عقل انسانی خود کوئی معاشرہ یا سسٹم بنائے گی تو لازما معاشرے کے طاقتور طبقات ہی مل کر معاشرے کیلئے قوائد وضوابط۔ یا قوانین بنائیں گے۔ عقل انسانی اگر کوئی بہت زیادہ مثالی معاشرہ بھی تشکیل دے لے تو پھر بھی اس میں سقم موجود رہتے ہیں، انسان اپنی نفسیات کے عین مطابق کچھ لوگوں کو اپنے تابع کر لے گا اور پھر ان لوگوں کی محنت کے محاصل کو لوٹ کھسوٹ کر اس پر عیاشی کرے گا۔ انسانی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ طاقتور انسانی گروہوں نے مجبور اور بے کسی لوگوں کا بہت زیادہ استحصال کیا ہے۔ وحی اسی قسم کے استحصالی معاشرے کی راہ میں رکاوٹ ہے، کیونکہ وہ کسی انسان یا انسانی گروہ کو دوسرے انسان یا انسانی گروہوں پر حکومت واختیار کا حق نہیں دیتی۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝۳۹ (سورۃ بنی اسرائیل:39)

یہ وہ پُر راز حکمت امور (اخلاقی اقدار) ہیں جو تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے، تجھ پر وحی کئے گئے ہیں۔ (2:269) تمہارے لئے زندگی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تم خدا کے سوا کسی کی حاکمیت کو تسلیم نہ کرو۔ اطاعت اسی کے احکام وقوانین کی کرو۔ اُس کے ساتھ، کوئی اور صاحبِ اقتدار ہستی شریک نہ کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے (یعنی خدا کے علاوہ کسی اور کو صاحب اقتدار تسلیم کر لو گے) تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم (شرفِ انسانیت سے گر جاؤ گے اور) طرح طرح کی ملامتوں کے ساتھ، دھتکارے ہوئے، جہنم کی تباہیوں میں جا گرو گے۔

عزیزان گرامی قدر وحی ہماری اس بات کی طرف راہنمائی کر رہی ہے کہ حکومت صرف اور صرف خدائے لم یزل کی ہوگی اس کے علاوہ نہ کسی کو حکومت کا حق ہے اور نہ اختیار اور نہ ہی کوئی حکومت کرنے کا اہل ہے۔ اور یہ حکومت ظاہر ہے براہ راست نہیں ہوتی یہ اللہ تعالیٰ کے قوانین کے ذریعہ ایک آئینی حکومت ہوتی ہے۔ اور یہ قوانین اس دنیا کے لیے قرآن میں آخری بار نازل کیئے گئے اور پھر ان کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب اگر کوئی مثالی معاشرہ تشکیل دیا جا سکتا ہے تو صرف ان ہی قوانین کی بنیاد پر ہی تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ مگر صورتحال کچھ اس طرح کی ہے کہ:

منزل و مقصود قرآن دیگر است رسم و آئین مسلمان دیگر است

(جاوید نامہ)

قرآن پاک کی منزل و مقصود اور ہے (مگر آج کل کے) مسلمان کا طریقہ اور آئین مختلف ہے۔

در دل او آتش سوزندہ نیست مصطفی در سینہ او زندہ نیست

(جاوید نامہ)

اس کے دل میں وہ آگ نہیں رہی جو (باطل کو) بھسم کر دے! اس کے سینے میں جناب رسول پاک ﷺ کی محبت موجود نہیں۔

بندہ مؤمن ز قرآن بر نخورد در ایاغ او نہ می دیدم نہ درد

(جاوید نامہ)

یہ مسلمان قرآن سے فائدہ نہیں اٹھاتا: اس کے جام میں نہ شراب ہے نہ تلچھٹ مسلمان قرآن سے فائدہ نہیں اٹھا رہا۔ اور یہ ہی داستان المناک ہے پوری انسانیت کی کہ ایک کتاب زندہ کو صرف اور صرف اس کے الفاظ دہرانے تک محدود کر لیا ہے۔ اور اس پر ایسی ملمع کاری کر دی گئی ہے کہ یہ اب عملاً متروک ہو چکی ہے۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ (سورۃ الفرقان:30)

اور رسول کہے گا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! یہی ہے میری وہ قوم جس نے اِس قرآن کو اپنے خود ساختہ معتقدات کی رسیوں سے اس طرح جکڑ دیا تھا کہ یہ آزادی سے دو قدم چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا (انہوں نے اپنے آپ کو اس کے تابع رکھنے کے بجائے اسے اپنے مسلک و مشرب کے تابع رکھ چھوڑا تھا۔ ہمیں کیا کرنا تھا؟ اور اس وقت ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

داستان کہنہ شستی باب باب فکر را روشن کن از ام الکتاب

(جاوید نامہ)

تم نے پرانی تاریخ کا ایک ایک باب دھو ڈالا ہے۔ اب اپنے فکر کو قرآن پاک سے روشن کر۔

چیست قرآن؟ خواجہ را پیغام مرگ دستگیر بندۂ بی ساز و برگ

(جاوید نامہ)

قرآن پاک کیا ہے؟ آقا کے لیئے موت کا پیغام ہے اور بے سروسامان ہندے کا دستگیر۔

ہیچ خیر از مردک زرکش مجو، لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا

(جاوید نامہ)

دولت کے پجاری سے کسی بھلائی کی امید نہ رکھو، قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ تم نیکی نہیں پا سکتے جب تک تم اپنی محبوب

ترین چیز اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرو انسان کی محبوب ترین چیز اس کی دولت وثروت ہے۔ اور اسی محبوب ترین چیز کو ساری مخلوق کے لیے قرآن کھلا رکھنے کا حکم دے رہا ہے۔ اور چند افراد چند خاندانوں یا چند گروہوں کی اجارہ داری کو ختم کرنے کا اعلان کر رہا ہے۔

رزق خود را از زمین بردن رواست این متاع بندہ و ملک خداست

(جاوید نامہ)

رزق کو زمین سے حاصل کرنا جائز ہے۔ زمین بندے کے لیے فائدہ اٹھانے کی چیز ہے لیکن ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ زمین بندوں کے لیے فائدہ اٹھانے کی چیز تھی مگر انسانوں نے اس پر بند لگا کر اسے چند افراد یا گروہوں تک محدود کر دیا۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ (سورۃ البقرہ:22)

یہ حفاظت تمہیں خدا کے عالمگیر نظام ربوبیت کی رُو سے ملے سکے گی جس کے مطابق اُس نے تمہارے لئے زمین میں ٹھکانے کا سامان پیدا کر دیا۔ اُو پر فضا میں کُرے بکھیر دیئے تا کہ باہمی کشش وجذب سے یہ اپنی اپنی جگہ برقرار رہیں۔ پھر ایسا انتظام کر دیا کہ آسمان سے پانی برسے جس سے تمہارے لئے سامانِ رزق پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام سامانِ زیست تمہیں خدا کی طرف سے بلا مزد ومعاوضہ ملا ہے۔ اِس پر ملکیت خدا ہی کی ہے، تمہیں صرف اِس کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔ لہٰذا تم ایسا نہ کرنا کہ انسانوں کو اِس کا مالک بنا دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ جانتے بوجھتے، خدا کے ساتھ شرک ہوگا۔ ذرائع پیداور پر ذاتی ملکیت (خواہ وہ کسی کی ہو) انسانوں کو خدا بنا دینا ہے۔ انہیں تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے کھلا رہنا چاہیے (41:9-10)۔

عزیزان گرامی قدر آپ نے سنا کہ ذرائع پیداوار پر ذاتی ملکیت (خواہ کسی کی ہو) انسانوں کو خدا بنا دینا ہے۔ اور ہم نے ایسا ہی کیا ہوا ہے۔

دہ وڑو وڑو خدایانو دی بندہ کڑم لویہ خدا یا ذہ بہ چا چا تہ سجدہ کڑم

(غنی خان)

مجھے چھوٹے چھوٹے خداؤں کا بندہ بنا دیا ہے اے بڑے خدا میں کِس کِس کو سجدہ کروں؟ میں سمجھتا ہوں کہ آج جو ہمیں چھوٹے چھوٹے خداؤں کے آگے سجدہ ریز ہونا پڑھ رہا ہے اس کے ذمہ دار ہم ہیں۔ اوپر ہم نے سنا کہ یہ حفاظت تمہیں خدا کے عالمگیر نظام ربوبیت کی رو سے مل سکتی ہے۔ اور قرآن کے نظام ربوبیت کو سمجھنے کے باوجود بھی ہم لوگوں تک نہ پہنچا سکے ہم میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ ہم حق پر ہیں مگر اس کے باوجود بھی ہم ناکام ہیں اگر مارکس اور اینگلز آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے اپنی مادی جدلیات اور معاشی سسٹم کو عام لوگوں تک جو بہت پڑھے لکھے بھی نہیں تھے فیکٹریوں اور کھیتوں میں کام

کرنے والے مزدور تھے ان تک پہنچا سکے تو ہم کیوں نہیں؟

اگر لینن اسی مارکسی فلسفہ کی بنیاد پر ایک انقلاب برپا کر سکتا ہے تو عزیزان گرامی قدر ہم کیوں نہیں؟ شاید آج ہمیں بھی ایک لینن کی ضرورت ہے جو نظام ربوبیت کو عملی طور پر نافذ کر سکے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست ❶

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست ❷

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست ❸

(اسرار خودی) (مولانا رومی)

❶ کل شیخ چراغ لیے شہر میں میں گھوم رہا تھا کہ میں جانوروں حیوانوں اور درندوں سے تنگ ہو گیا ہوں۔ مجھے کسی انسان کی آرزو یا تلاش ہے۔

❷ یعنی جو آدمی ہر جگہ چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں ان کی حقیقت چوپایوں اور درندوں کی سی ہے۔ ان سست الوجود اور نکمے ہمراہیوں سے تو میرا دل بیزار ہو گیا ہے۔ مجھے شیرِ خدا اور رستم دستاں (جیسے شجاع اور بہادر انسان) کی تلاش ہے۔

❸ میں نے کہا وہ تو مل نہیں رہا جسے آپ تلاش کر چکے ہیں۔ جواب میں شیخ نے کہا کہ وہ جو مل نہیں رہا اسی کی تو مجھے تلاش و آرزو ہے۔

(یہ مضمون کنونشن طلوعِ اسلام 2024ء میں پڑھا گیا)

سانحہ ارتحال

محترم اقلیم خان صاحب، نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام علیگر امہ سوات کی والدہ ماجدہ وفات پا گئی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عنایت فرمائیں۔ ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

سانحہ ارتحال

بزمِ طلوعِ اسلام لاڑکانہ کے نمائندہ اللہ بخش وفات پا گئے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عنایت فرمائیں۔ ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

جمیل احمد عدیل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انشاءاللہ

اپنے کسی معاصر کی صلاحیتوں کا اعتراف مشکل کاموں میں سے ایک ہے اور اگر وہ ہم عصر ہم عمر ہو تو مذکورہ کام اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ قارئین آگاہ ہیں بلکہ گواہ ہیں کہ ہم نے ہمیشہ اپنے معاصر ''زیرو پوائنٹ'' والے جاوید چودھری کے لئے کلماتِ تحسین ہی لکھے ہیں' بلاشبہ وہ تعریف کے جائز حق دار ہیں کہ انہوں نے اک زمانہ بڑی جرأت کے ساتھ کلمۂ حق کہا' جی ہاں جابر سلطان کے سامنے' پھر ان کا منظر نامہ + بیانہ + طرزِ تحریر اتنا دلنشیں ہوتا ہے کہ اسے ایک عمدہ افسانے کی متعدد دلکشیوں سے مزین قرار دیا جا سکتا ہے۔ ویسے ہم نہیں جانتے کہ نسلِ نو کے اس سب سے اہم کالم نگار کے ساتھ کیا واقعہ ہوا ہے کہ ملک جب سے مشرف بہ پرویز ہوا ہے' جاوید صاحب کے ہاں وہ بانکپن نہیں رہا۔

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں' نہ وہ حُسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی' نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

خیر بندہ بشر ہے' سو مجبوریاں' ہزار مسئلے مسائل ہوا کرتے ہیں' گفتنی بھی ناگفتنی بھی۔ غالباً کسی مجبوری کی وجہ سے ہی ہمارے مذکورہ ممدوح عقیدۂ جبر کے مبلغ بن گئے ہیں جس کی ایک مثال 23 ستمبر 2004ء کے روزنامہ ''جنگ'' میں چھپنے والا ان کا کالم ''انشاءاللہ'' ہے۔ آج ہم ان کے اس کالم کے حوالے سے دو ایک باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں۔

آپ لکھتے ہیں؟ ''ٹی وی خبر نامہ..... میں موسم کی پیش گوئی کرنے والی خاتون یا صاحب بڑے آرام سے کہہ دیتے ہیں آئندہ چوبیس گھنٹوں میں فلاں فلاں علاقے میں بارش ہوگی اور فلاں فلاں جگہ پر موسم خشک رہے گا۔ میں جب بھی یہ سنتا ہوں میرے دل میں خواہش انگڑائی لیتی ہے' کاش یہ اس کے ساتھ انشاءاللہ کہہ دیتے تو پیش گوئی' پیش گوئی نہ رہتی دعا بن جاتی اس میں برکت آ جاتی..... اسی طرح اگر ریلوے' پی آئی اے اور پرائیویٹ بس سروسز کی انکوائری میں بھی انشاءاللہ کا اضافہ ہو جائے' اگر آپ ریلوے انکوائری فون کریں ان سے پوچھیں' ریل کا رکب پہنچے گی اور وہ جواب میں فرمائیں انشاءاللہ ریل کار وقت پر پہنچ جائے گی۔ یہ معاشرے میں ایک مثبت تبدیلی ہوگی۔ اگر ہم ریسکیو 15' فائر بریگیڈ اور ایمبولینس سروس کے عملے کو بھی ''انشاءاللہ'' کی ٹریننگ دے دیں' وہ ہنگامی کال کے جواب میں فرمائیں' ہم انشاءاللہ چند منٹوں میں آپ کے پاس پہنچ رہے ہیں' تو اس سے دلوں کو بہت تسکین پہنچے گی' اسی طرح اگر ہم دفتروں کے نظام اوقات کے ساتھ انشاءاللہ لکھوا

دیں، جج صاحب سائل کو تاریخ دیتے وقت انشاء اللہ کہہ دیں، ڈاکٹر صاحب مریض کے لئے دوا لکھتے ہوئے، موٹر مکینک مالک کو گاڑی واپس کرتے ہوئے اور ٹیکسی ڈرائیور سواری کو منزل مقصود تک پہنچانے کا وعدہ کرتے ہوئے انشاء اللہ کہہ دے تو ان لوگوں کے کام میں اللہ کی رضا اور مدد شامل ہو جائے گی۔''

صاحبو! مکرم جاوید چوہدری کے نقطۂ نظر پر ہم اپنے تحفظات کا اظہار بعد میں کریں گے، پہلے آپ ایک مزے کی بات سن لیں۔ ہمارے تبلیغی جماعت والے بی بے اور میٹھے میٹھے بھائی اپنا پیغام لے کر کسی کے پاس گئے، اپنا کل عندیہ گوش گزار کرنے کے بعد اس زیر تبلیغ سے کہا: آج فلاں مسجد میں مغرب کے بعد بیان ہوگا، تشریف لائیے گا؟ وہ صاحب کہہ بیٹھے ''انشاء اللہ''۔ اب تبلیغی گروہ میں شامل ایک ذہین ساتھی غالباً ان کی نیت بھانپ کر برجستہ بول اٹھے: ''دیکھئے صاحب! انشاء اللہ کے دو مفہوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ میرا مکمل ارادہ ہے اگر اللہ نے چاہا تو میں ضرور آؤں گا۔ دوسرا یہ کہ میرا تو بالکل سرے سے کوئی ارادہ نہیں، اگر اللہ نے ایسا چاہا تو مجبوری بن جائے گی آنا ہی پڑے گا۔ کہئے آپ کا کیا ''ارادہ'' ہے؟

دوستو! اب ہم جاوید چوہدری صاحب سے بے حد سادہ، ہر پیچ، ہر باریکی اور ہر فلسفے سے ہٹ کر یہ استفسار کرتے ہیں کہ اگر ریل کار کا ڈرائیور یہ کہتا ہے کہ میں شام چار بجے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤں گا، انشاء اللہ! اور وہ اپنی غفلت کی وجہ سے گاڑی اتنی لیٹ کر دیتا ہے کہ وہ اگلے روز چار بجے شام پہنچتی ہے، جب آپ اس کا محاسبہ کریں کہ میاں یہ تم نے کیا کیا؟ تو وہ کہے جناب! میں نے کہا تھا انشاء اللہ، اب اگر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں چاہا تو جا کر اس سے پوچھیں، میرے ساتھ سوال جواب کر کے اپنا اور میرا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟ تو ہمارے فاضل کالم نگار کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

باقی رہیں اس کلمے کے استعمال سے برکات کی شمولیت، تو معذرت کے ساتھ اس تکیہ کلام کا سب سے زیادہ استعمال ہمارے حکمران اور سیاستدان کرتے ہیں۔ ''ہم اقتدار میں آ کر انشاء اللہ اس ملک کی حالت یکسر تبدیل کر دیں گے، ہم انشاء اللہ اسلامی نظام نافذ کریں گے، ہم انشاء اللہ غربت، بدامنی، دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے.....!'' اب ہوتا کیا ہے وہ انشائیے اقتدار میں آ جاتے ہیں، مگر حالات پہلے سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں، نہ غربت میں کمی ہوتی ہے، نہ امن و امان کی صورتحال میں کوئی مثبت تغیر رونما ہوتا ہے، نہ دہشت گرد اپنے انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایسے میں ان دعاوی کرنے والوں سے پوچھا جائے، کیوں بھئی یہ سب کیا ہے؟ تو وہ پولے سے منہ سے یہ جواب دے دیں کہ اے معترضو! ہم نے کہا تھا انشاء اللہ۔ اب اگر اللہ کی مرضی ہی نہیں تھی تو ہماری کوششیں بے ثمر ہی رہنی تھیں، چنانچہ نکتہ چینو! یہ تم ہم پر زبانِ طعن دراز کر رہے ہو یا اللہ میاں پر؟ ہم نہیں جانتے جاوید چوہدری صاحب اس کا کیا جواب ارشاد فرمائیں گے؟

اور آگے بڑھئے ایک آدمی پورے عزم کے ساتھ یہ کہتا ہے، انشاء اللہ میں رشوت خوری کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دوں گا۔ اور وہ اپنے اس دعوے میں ''صادق'' ثابت ہوتا ہے تو اب اس کا کریڈٹ کس کو جائے گا؟ کون اس صورتحال کا ذمہ دار ہو گا؟ ڈاکٹر کہتا ہے انشاء اللہ میری دوا سے مریض صحت یاب ہو جائے گا، اب اپنے بغلی میڈیکل سٹور سے وہ جعلی دوا نکال کر

مریض کو تھما دیتا ہے' جب مریض اگلے جہان سیاحت پر روانہ ہو جائے اور ورثاء ڈاکٹر سے پوچھیں حضرت آپ کی دوا سے مریض تو مر گیا' اس پر وہ ڈاکٹر طیش میں آ کر کہے: ''او کافرو! میں نے انشاء اللہ کہا تھا۔ اللہ کی مرضی پر معترض ہوتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟ تو فرمایئے کیا کہا جائے گا بیچ اس مسئلہ کے؟

یہاں جب انشاء اللہ کے مروج جواز کی غار ریسکیو 15 والوں کو فراہم کر دی جائے گی تو وہ کتنی آسانی کے ساتھ اپنی بداعمالیوں پر پردہ ڈال لیں گے۔ یہی سائبان جب فائر بریگیڈ والوں کے سروں پر تان دیا جائے گا تو انہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ آگ نہ بجھانے کا الزام اپنے سر لیں۔ ایمبولینس والے کی جب جیب گرم نہیں کی جائے گی تو وہ مریض کی خواری یا میت کی رسوائی پر سیدھا سادا جواب دے کر فارغ ہو جائے گا' ''میرے مولا کی یہی مرضی تھی''۔

خدارا موسم کی پیش گوئی کرنے والوں کو اپنے علم' مشاہدے اور آلات پر اعتماد کرنے دیں تاکہ ان کی نشر کردہ اطلاعات پر ناظرین و سامعین کو بھی یقین آ سکے ورنہ 'انشاء اللہ' کہہ کر تو ایک لمحے میں ان کی ''چھٹی'' ہو جائے گی اور یہاں ضمناً یہ بھی عرض ہے کہ پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا سے جاری ہونے والی خبریں' اطلاعات ہوتی ہیں' دعائیں نہیں۔ اب اگر جاوید چوہدری صاحب کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے نیوز کاسٹر کے حسین لبوں سے یہ پھول جھڑیں کل انشاء اللہ جنوبی پنجاب میں شدید طوفان آئے گا۔ پشاور اور سرحد کے بالائی علاقوں میں انشاء اللہ زلزلے کے زبردست جھٹکے محسوس ہوں گے۔ فلاں پہاڑ میں انشاء اللہ تباہ کن آتش فشاں پھٹے گا۔ آج رات انشاء اللہ ایک سمندری طوفان ساحلی علاقوں کو غرقاب کر دے گا۔ گوادر میں انشاء اللہ آسمانی بجلی گرے گی' جیکب آباد میں انشاء اللہ تیز رفتار بگولوں سے تاریخی بربادی ہوگی..... وغیرہ وغیرہ تو پلیز بتایئے ان دعائیہ خبروں سے خلق خدا کو کتنے نفلوں کا ثواب ہوگا؟ اس جہت پر غور کیوں نہیں کیا جاتا کہ بارشیں ہوں یا آندھیاں' موسموں کی خشکی ہو یا تری' ہواؤں کے دباؤ میں کمی ہو یا بیشی' درجۂ حرارت کا بڑھنا ہو یا گھٹنا..... یہ سارے عوامل کسی کے لئے مفید ہوتے ہیں اور کسی کے لئے مضر۔ اب جس کی فصل پک کر تیار کھڑی ہے اسے یہ بشارت سنانی کہ انشاء اللہ کل سہ پہر ژالہ باری سے سب برابر ہو جائے گا۔ وہ متاثرہ کسان اس ''دعا'' پر ٹی وی والوں کو کیا گولڈ میڈل پیش کرے گا؟ اگر خبروں کو حصولِ برکات کی مقدس غرض سے مناجات یا دعائیں بنانا ہے تو پھر خبر کا متن یوں ترتیب پائے گا۔ 'جن لوگوں کو بارش کی ضرورت ہے' کل ان کے لئے انشاء اللہ ابرِ کرم کھل کر برسے گا اور جنہیں بارش کی ضرورت نہیں انشاء اللہ وہ سب بارش کی تعذیب سے محفوظ رہیں گے۔'

بھئی یہ بڑی سیدھی سی بات ہے چاند گرہن لگنا ہے یا سورج گرہن' موسم میں کوئی تغیر رونما ہونا ہے یا زلزلہ آتا ہے..... ان سب طبعی عوامل کی بابت تو موجودہ سائنسی علوم کی روشنی میں عوام الناس کو صرف اور صرف خبر/ اطلاع پہنچانا مقصود ہوتا ہے تاکہ فطرت کے اتار چڑھاؤ کے بارے میں جانکاری حاصل کر کے انسان اپنا لائحہ عمل تیار کرے اور اس کے مضرات سے مامون رہ سکے اور اگر وہ تبدیلی اس کے لئے فائدہ مند ہے تو بھرپور طریقے سے اس سے استفادہ کر سکے۔

جاوید چوہدری صاحب! یہ پیاسی قوم پہلے ہی انصاف کے پانی کے لئے برسوں سے تڑپ رہی ہے اس ترسی ہوئی قوم پر رحم کیجئے، جج صاحب کو پوری منصبی ذمہ داری کے ساتھ سائل کو تاریخ دینے دیجئے، اگر انشاء اللہ کے مروج مفہوم کے ساتھ تاریخ دی جائے گی تو معینہ تاریخ کو جج صاحب ضمیر کے ہر بوجھ سے آزاد ہو کر ساحلِ سمندر پر اپنے اہل وعیال کے ساتھ پکنک منا رہے ہوں گے اور سائل بے چارہ عدالتوں میں دھکے کھا رہا ہوگا اور اسے سارا دن بٹھا بٹھا کر سوا تین بجے ریڈر نئی تاریخ دے رہا ہوگا غالباً انشاء اللہ کہہ کر۔ ذرا سوچئے ججوں اور ریڈروں کو بھی کہیں جوابدہ کرنا ہے یا انشاء اللہ کے ذریعے انکو کھلی چھٹی دے دینی ہے؟

یہ سب ہم اس لئے زور دے کر عرض کر رہے ہیں کہ سماج کا کوئی فرد خود کو احتساب سے بالا نہ سمجھ بیٹھے۔ اگر اس سے کچھ اچھا بن آتا ہے تو وہی انعام کا مستحق ہے، اگر اس سے کوئی کوتاہی سرزد ہوتی ہے تو وہی عقوبت کا سزاوار ہے۔ دوسری صورت میں تو نہ وہ شاباش کا استحقاق رکھتا ہے نہ اس پر کوئی حد جاری کی جاسکتی ہے کہ ''کرنے والا'' تو کوئی اور ہے۔ واضح رہے یہاں یہ استدلال قائم کرنا بالکل بے معنی ہوگا کہ انشاء اللہ کہہ کر اگر کوئی جان بوجھ کر بدعملی کرتا ہے تو وہ خود ذمہ دار ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ۔ اس لئے کہ انشاء اللہ کا تو مطلب ہی یہ بتایا جاتا ہے ''اگر اللہ نے چاہا تو''۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کچھ اللہ کے چاہنے کے بغیر ہو جائے خاص طور پر جب کام سے پہلے فاعل بالصراحت یہ کہہ چکا ہو انشاء اللہ۔ ظاہر بات ہے جو ہوتا ہے اللہ ہی کی مرضی سے ہوتا ہے، بندے کی تو کوئی مرضی ہوتی ہی نہیں۔ کیا کہا ہوتی ہے؟ اگر ہوتی ہے تو پھر انشاء اللہ کی ادائیگی کیا محض رسم ہے؟ اس سے بڑھ کر توہین اور کیا ہوگی کہ مرضی بندے کی ہو، ذمہ دار وہ خود ہو اور زبان سے کہا جائے اللہ کی مرضی۔ کیا بندے سے مراد اللہ ہے یا اللہ سے مراد بندہ ہے؟ اس پیچ میں سے ہمارے صوفی بھائی ہی نکل سکتے ہیں کہ ان کے پاس وحدۃ الوجود کی صورت میں بڑی خاص ترکیب موجود ہے جو اس نوعیت کے ہر مسئلے کا بہترین حل ہے۔

اس سلسلے کو کوئی جتنا چاہے طول دے لے، بنیادی سوال وہی ہے کہ انسان کے اعمال کا ذمہ دار خدا ہے یا انسان خود ہے؟ اگر روایتی انداز میں سوچنا ہے تو پھر آج سے بلکہ ابھی سے تمام انسانوں کو بے خطا اور بے قصور قرار دے کر جزا سزا کے ہر عمل سے اسے بری کر دیں۔ دنیا میں انصاف پہنچانے والے جملہ اداروں پر تالے لگوا دیں اور آخرت میں جنت جہنم ایسے وقیع مقامات کو بھی فی الفور بے فائدہ کہہ ڈالیں۔ عراق میں مسلمانوں پر بش مظالم کے پہاڑ توڑ رہا ہے تو اس میں بھی یقیناً اللہ کی مرضی شامل ہوگی۔ یہاں جن غاصبوں نے مخلوق خدا کا جینا حرام کر رکھا ہے تو ان محترموں کے عقب میں بھی پھر اس عظیم خدا کا ہاتھ کام کر رہا ہوگا۔ یاد ش بخیر ماضی قریب میں ایک مطلق العنان ''بادشاہ'' اس قوم کو ''عطا'' ہوئے تھے انہوں نے فرمایا تھا نوے دن میں الیکشن کروا کے انشاء اللہ فوج بیرکوں میں واپس چلی جائے گی۔ پھر ''اللہ'' نے یہ چاہا کہ گیارہ برس اسی طرح بیت جائیں اور چشمِ تماشا نے دیکھا کہ ایسا ہی ہوا اور وہ صاحب آنجہانی ہو گئے مگر وردی اتارنا پسند نہیں کیا۔ اوپر والے کے

لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ ہمارے فیورٹ رائٹر اور سپیکر مرحوم اشفاق احمد نے بھی اس دور میں الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے قوم کو دن رات یہی سبق ذہن نشین کروایا کہ جو ہوتا ہے اللہ ہی کی مرضی سے ہوتا ہے' مقبول مومن وہی ہے جو چوں چرا نہ کرے اور راضی برضا رہے۔ ہمارا ایک دم بے طرح جی چاہا کہ موجودہ مقتدر کی بارگاہ میں عرض کریں کہ وہ بلا تاخیر قوم سے صرف ایک جملے پر مشتمل خطاب فرمائیں اور اسے مژدہ سنائیں' ''میں بہت جلد وردی اتار دوں گا انشاء اللہ''! بس اس کے بعد خاموش ہو جائیں۔ پھر دیکھیں خدا کیا کرتا ہے؟ ساری قوم کو بالعموم چپ لگ جائے گی' بالخصوص ہمارے ایم ایم اے کے قائدین کا تو ہمیشہ کے لئے منہ بند ہو جائے گا۔ ہمارا نہیں خیال ہمارے یہ مذہبی رہنما ''خدا'' کے فیصلوں پر کبھی اعتراض کریں گے۔

جاوید بھائی! چلتے چلتے ایک صراحت اور کر دیں اب تک جس غربت' ناانصافی اور لاقانونیت پر آپ اپنے سینکڑوں کالموں میں صدائے احتجاج بلند کر چکے ہیں' ذرا تحمل کے ساتھ بتایئے اس واویلے کی کیا ضرورت تھی؟ جب سب کچھ اسی اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے؟ ممکن ہے اس کے جواب میں مکتب کے ملا کی طرح آپ بھی یہی ارشاد فرمائیں کہ ناانصافیاں بھی اللہ کے حکم سے ہو رہی ہیں اور ان ناانصافیوں کے خلاف آواز بھی اللہ کے حکم کے تحت اٹھائی جا رہی ہے۔ سچ کہتے ہیں اس جواب پر ہم لاجواب ہو جائیں گے۔

ارے نہیں صاحب! خدا انکردہ ہم خدا کے منکر نہیں ہیں' نہ اس کے قادر مطلق ہونے کے بارے ہمیں کوئی شک و شبہ ہے۔ ہمیں تو بس اس عظیم و رحیم خدا پر لگنے والے الزام کا دفاع کرنا ہے کہ وہ ہستی متذکرہ تہمتوں سے یکسر پاک ہے۔ اس نے خود اپنی مرضی' خالص اپنے اختیار سے انسانوں کو بااختیار بنایا ہے اور اس کے بااختیار اور قدیر و قادر ہونے کی ہمارے پاس سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ کوئی بے اختیار دوسرے کو بااختیار نہیں بنا سکتا' بااختیار وہی بنا سکتا ہے جو خود بااختیار ہو۔ جی ہاں اسی بااختیار اور بزرگ و برتر خدا نے اپنی آخری کتاب میں دوٹوک الفاظ میں فرما دیا ہے۔

''ان سے کہہ دو کہ حق خدا کی طرف سے آ گیا ہے اب جس کا جی چاہے قبول کر لے' جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔''

''انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔''

''جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے' وہ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔''

ایک مقام پر بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے پوری نسلِ انسانی کو جھنجھوڑا گیا ہے۔

''ان کی تباہی ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی۔''

اسی طرح خدا کے قوانین میں ملاوٹ کرنے والے بددیانتوں کی قوم کو یہ وعید سنائی گئی۔

''کہ وہ دنیاوی زندگی میں ذلیل وخوار ہوتی ہے اور قیامت کے دن اس پر اس سے بھی زیادہ سخت عذاب مسلط کیا جائے گا۔''

اس مضمون کی قرآن مجید میں کئی آیتیں ہیں' عاد وثمود سے لے کر ابرہہ وابولہب تک کتنے ہی کردار اور کتنے ہی مقام آئے ہیں جہاں قدم قدم پر ہر انسان کو یاد کروایا گیا ہے کہ میرے قوانین کی نافرمانی کا لازمی نتیجہ تمہیں بھگتنا ہوگا' انسان ہی اپنے اعمال وافعال کا مکمل ذمہ دار ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر ''اللہ کی مداخلت'' کا کیا کوئی جواز رہ جاتا ہے؟

قصہ تو بس اتنا ہے کہ جب قوموں کی گھٹی میں غلامی کی خُو رچ بس جاتی ہے تو وہ اپنے عملوں کا ذمہ دار اپنی بجائے اپنے رب کو قرار دے کر فارغ ہو جاتی ہیں۔ ظاہر و باہر ہے کہ اس آئیڈیل صورتحال کا سب سے زیادہ فائدہ ''خداوندانِ اقتدار'' کو پہنچتا ہے' سرمایہ داروں کو پہنچتا ہے' مذہبی پیشواؤں کو پہنچتا ہے۔ عوام بلکہ رعایا راضی برضا ہو جاتے ہیں کہ یہ مقتدر ہم پر اس وقت تک قابض رہیں گے جب تک اوپر والا چاہے گا' امراء تب تلک چھینا جھپٹی سے اکٹھی کی گئی دولت سے آسائشیں خریدتے رہیں گے جب تک ان کو اجازت دینے والا چاہے گا اور ہم عوام تب تک زمین کے سینے سے چمٹے کیڑوں کی طرح برابر رینگتے رہیں گے جب تک ''اس'' کی مرضی ہوگی۔

خدارا' خدا سے وہ بات تو منسوب نہ کریں جو اس نے کبھی کی نہیں اگر اس خالق اعظم سے دل میں معمولی سا بھی لگاؤ ہے تو اس کے اس قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۷﴾ (32:17)

یہ ان کے اپنے اعمال کا بدلہ ہے۔

پیارے قارئین! بات ادھوری رہ جائے گی' اگر یہ تصریح نہ کی گئی' پھر ''انشاءاللہ'' کا حکم کیوں آیا ہے؟ انشاءاللہ کہے بغیر انسان/مسلمان کے ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ واضح سی بات ہے ''انشاءاللہ'' کے کچھ ایسے معانی ہوں گے جو متذکرہ صدر نصوص کے موید ہوں ورنہ خاکم بدہن قرآن کو متضاد احکامات کا مجموعہ تسلیم کرنا پڑے گا' نیز مجبوراً ناسخ ومنسوخ ایسے لایعنی حیلے تراشنے پڑیں گے۔ روایتوں کو آیتوں پر ترجیح دینی پڑے گی۔

ضروری ہو گیا ہے کہ اس مرحلے میں سورۃ کہف کی ان آیات کا ترجمہ نقل کیا جائے جس کو بطور حوالہ جاوید چوہدری صاحب نے اپنے کالم میں درج کر کے اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔

''اور ہرگز ہرگز کسی کام پر یوں نہ کہنا میں اسے کل کروں گا مگر ساتھ ہی انشاءاللہ کہہ لینا اور اگر بھول جاؤ تو جب یاد آ جائے اس وقت کہہ لینا اور کہتے رہنا کہ مجھے پوری امید ہے میرا رب مجھے اس سے بھی زیادہ ہدایت کے قریب کرے گا۔''

اب ہمارے مکرم حبیب جاوید چوہدری نے نادانستگی میں وہی کام کیا ہے جو عصرِ حاضر کے ننانوے فی صد علماء کر رہے

ہیں کہ قرآن کی آیت کو کسی روایت کے ساتھ بریکٹ کر کے تفہیم کی راہیں متعین کرتے ہیں' چاہے اس سعی میں قرآن مجید کے احکامات آپس میں متصادم ہو کر ہنگامہ برپا کر دیں' پروا نہیں۔ اس فارمولے کو لگانے سے پہلے اگر ذہن میں یہ نکتہ رکھ لیا جائے کہ آیات کی پوزیشن قطعی' حتمی اور یقینی ہے' الفاظ کی حد تک' متن کی حد تک اس وادی میں سے تشکیک وارتیاب کی چیونٹی بھی گزر نہیں سکتی جبکہ روایات کو آپ آیات کی طرح ہر التباس سے منزہ کسی طرح قرار نہیں دے سکتے کہ بہرحال قرآن کی حفاظت کا وعدہ اللہ نے کیا ہے' روایات کے تحفظ کا وہ ضامن نہیں ہے۔ بے شک اکثریت نے خوش نیتی سے اس ذخیرے کو جمع کیا ہوگا مگر دو تین صدیاں بیچ میں حائل ہونے کے سبب آمیزشیں ہوئی ہوں گی جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ جامعین نے قریب قریب اسی فی صد روایات کو مسترد کر کے باقی کو رکھا ہے اور جو ہے اس کے متعلق بھی مکمل یقین کے ساتھ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ان کی صحت ہر شبہ سے بالا ہے۔

اس تناظر میں وہ روایات بطور خاص بڑی ہی احتیاط کے ساتھ نظرِ ثانی کی محتاج ہیں جن میں خاتم الانبیاء حضرت اقدس محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی فہمائش کے پہلو برآمد ہوتے ہوں۔ پھر ان روایات کی سیڑھی استعمال کر کے ان آیات کی یوں تفسیر کی جائے کہ اس عظیم اور پاکیزہ ہستی کو کٹہرے میں کھڑا کر کے جرح کی جائے۔ ایک نہیں کئی آیات ایسی ہیں اگر روایات کے پس منظر سے جدا کر کے دیکھی جائیں تو خالص قرآنی سیاق وسباق میں وہ عظمت نبویؐ کی روشن شہادت دیتی ہوئی نظر آتی ہیں جبکہ دوسرے زاویے یعنی ''روایتی اندازِ نظر'' سے انہیں دیکھا جائے تو آپؐ کی شخصیت کا اور ہی رنگ سامنے آتا ہے۔ ہماری رائے میں حضور ﷺ کی شخصیت کا تقدس سب پر مقدم ہے کیونکہ آپؐ کی ذات کے سرفراز ہونے کا شاہد خود رب کریم ہے۔ قرآن صاحب قرآن کی سیرت کو جس طرح پیش کرتا ہے' وہی قابل قبول ہونی چاہئے' اسی اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنی چاہئے نہ کہ ''اپنے'' اور ''غیر'' مؤرخین کی تقلید میں آپؐ کے مرتبے کا تعین کر کے سوئے ادب کا مرتکب ہونا چاہئے۔

اب پہلی بات تو یہ ہے کہ سورۃ کہف کی 24,23 نمبر محولہ آیات میں پس منظر کہیں بیان نہیں ہوا جس کو جاوید صاحب نے بطور اساس کے اپنے مضمون میں پیش کیا ہے۔ ہاں آپؐ کی وساطت سے پوری امت کو ایک خوبصورت سبق ضرور ذہن نشین کروایا گیا ہے کہ ''انشاء اللہ'' کہا کرو۔ یقیناً اللہ کا یہ حکم بھی غیر معمولی حکمت کا حامل ہوگا' شعور کی اس جہت کا ہر زاویہ لازماً حیران کن نور سے معمور ہوگا اور قرآن کے مرکزی نکتے کو مضبوطی اور پختگی عطا کرنے والا ہوگا یعنی ذہن انسانی کو قانون ربانی پر آمادہ کرنے کی کوشش سے بھرپور ہوگا۔

صد افسوس فاضل کالم نویس نے اپنی تحریر میں ''انشاء اللہ'' کو اسی مفہوم کا لبادہ پہنایا ہے کہ اگر اللہ نے چاہا' اگر اللہ کی مرضی ہوئی یعنی بندے کی مرضی چل نہیں سکتی' چلے گی تو اللہ کی مرضی چلے گی۔ انہیں یہی کہنا چاہئے تھا کہ عام طور پر ''ان'' کا ترجمہ ''اگر'' ہی کیا جاتا ہے اور ''نشاء'' کو عموماً ''چاہنے'' سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے اور ''اللہ'' کو ساتھ ملا کر ترجمانی یوں کر دی جاتی

ہے ''اگر اللہ نے چاہا تو.....'' یہ عمل کرنے کو تو کر دیا جاتا ہے لیکن اس طرف کوئی غور نہیں کرتا کہ اس طرح قرآن حکیم کے مجموعی نظام فکر کی عمارت میں جو دراڑیں پڑتی ہیں اس کا ذمہ دار کون ہے؟

قرآن مجید سے سچا اور خالص عشق رکھنے والوں نے ''شاء'' کا اس مقام پر ترجمہ لغت کی رو سے ''مشیت'' یا ''قانونِ مشیت'' کر کے اللہ کے دین کی آبرو بچالی ہے۔ اللہ کا نظامِ رحمت ایسے مخلصین پر اپنے لطف و کرم کی مسلسل پھوار سے گلاب کے ارغواں پھول کھلائے۔ سنئے ان میں سے ایک ایسے فیض رساں' ممتاز اور عظیم مفکر قرآن کے زندہ الفاظ کی تلخیص ''ان' کے ایک اور معنی بھی ہیں جنہیں بدقسمتی سے ہمارے ہاں قرآنِ مجید میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ عربی گرامر کی رو سے کہا جائے گا کہ یہ حرف' تعلیل یا سبب بیان کرنے کے لئے آتا ہے۔ یعنی جس مفہوم کے لئے ہم اردو زبان میں 'چونکہ' استعمال کرتے ہیں' عربی زبان میں ان معانی کے لئے 'ان' بھی آتا ہے۔ سیوطی نے اتقان میں اس کی کئی مثالیں دی ہیں۔ 'ان' کے ان معانی کی رو سے دیکھئے کہ انشاء اللہ کا مفہوم کیا مرتب ہوتا ہے..... کتب لغت میں ہے 'ان' بمعنی 'اذ' بھی آتا ہے۔ جس کا ترجمہ 'جب' ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے دیکھئے کہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ وہی انشاء اللہ جو فقدان یقین اور عدم خود اعتمادی کے لئے بولا جاتا تھا۔ اب حتم و یقین اور کامل خود اعتمادی کا آئینہ دار ہو گیا۔ یہ ہے انشاء اللہ کا قرآنی مفہوم۔

سیوطی نے ان بمعنی ''چونکہ'' یا ''جب'' کے سلسلہ میں جو مثالیں دی ہیں وہ بڑی واضح ہیں' مثلاً سورۃ آل عمران کی مشہور آیت

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

چونکہ تم مومن ہو اس لئے تم دنیا میں سب سے بلند مقام پر ہو گے۔

سورۃ فتح میں ہے:

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ (48:27)

چونکہ تمہارا پروگرام خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہے۔ اس لئے تم ضرور امن و عافیت سے کعبہ (یا مکہ) میں داخل ہو گے۔

جب حضرت یوسفؑ کے والدین اور دیگر اہل خاندان مصر میں آئے تو آپ نے ان سے کہا:

قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ (12:99)

چونکہ یہ سب کچھ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہو رہا ہے اس لئے تم مصر میں امن اور آرام سے رہو گے۔

جب حضرت موسیٰؑ کے خسر نے حضرت موسیٰؑ سے زندگی کا اہم معاملہ طے کیا تو ان سے کہا کہ

سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ (37:102)

چونکہ میں خدا کے قوانین کا پابند ہوں اس لئے تم مجھے اچھے لوگوں میں سے پاؤ گے۔

اس علمی صراحت کے بعد سورۃ کہف کی آیات 23 اور 24 کا مفہوم کچھ اس طرح سامنے آئے گا۔

''یہ غیب کے علم کی باتیں ہیں انہیں خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ غیب کے سلسلہ میں انسان کی یہ حالت ہے کہ کسی دوسرے کے متعلق تو ایک طرف وہ خود اپنے متعلق بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ میں کل ایسا ضرور کروں گا۔ انسان جس کام کا ارادہ کرتا ہے اگر اس کے لئے وہ تمام اسباب و ذرائع جمع ہو جائیں جو اس کامیابی کے لئے از روئے قانون خداوندی ضروری ہیں تو پھر وہ ارادہ پورا ہو سکتا ہے۔ اس لئے ارادہ کرنے کے بعد انسان کی توجہ ان اسباب و ذرائع کے مہیا کرنے پر مرکوز ہونی چاہئے۔ اگر اس سلسلہ میں کوئی کڑی بھول جائے اور اس طرح اس میں کامیابی نہ ہو سکے تو ہمت ہار کر نہیں بیٹھ جانا چاہئے بلکہ یہ سوچنا چاہئے کہ وہ کون سی وجہ ہے جس سے اس مقصد میں کامیابی نہیں ہو رہی یا تاخیر ہو رہی ہے' اگر یوں متعلقہ قوانین کی کڑیوں کو ایک ایک کر کے سامنے لایا جائے تو منزلِ مقصود تک پہنچنے کا قریب تر راستہ سامنے آ سکتا ہے۔ لہٰذا یقینی طور پر یہی کہنا چاہئے کہ مقصد پیشِ نظر کے حصول کے لئے قانونِ خداوندی کی رو سے جن اسباب و علل کی ضرورت ہے' اگر مہیا ہو گئے تو پھر یہ کام ہو جائے گا۔''

(ماخوذ۔ مفہوم القرآن' جلد دوم)

نتیجہ اس ساری گفتگو سے یہی نکلتا ہے کہ انسان کے سامنے بالعموم دو طرح کے معاملات ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جن کے متعلق وہ اپنے تجربے' علم اور مشاہدے کے بعد قریب قریب نہیں بالکل قطعی نتیجے پر پہنچ چکا ہے' مثلاً سادہ سی بات ہے اسے معلوم ہے کہ سورج نامی ایک چیز اس کے نظامِ شمسی سے وابستہ ہے اور یہ ستارہ زمین کے حوالے سے طلوع و غروب کا ایک سسٹم رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کے ظاہر ہونے اور چھپنے کے متعلق وہ کسی تذبذب کا شکار نہیں ہوگا اور کامل حتم و یقین کے ساتھ کہہ دے گا کہ کل فلاں خطے میں اتنے بج کر اتنے منٹ پر سورج نکلے گا۔ یا اس وقت پاکستان میں یہ وقت ہوا ہے' سورج اس پوزیشن میں ہے اور عین اس وقت امریکہ میں ان ہر دو حوالوں سے صورتحال یہ ہے اور یہ سب انفرمیشن اس نے قانون خداوندی کے بغور مشاہدے سے حاصل کی ہے۔ اب یہی بات جب وہ انشاء اللہ کے اضافے کے ساتھ کہے گا تو اس کی مراد یہ ہوگی' چونکہ اصولِ ربانی یہی ہے اس لئے ایسا ہی ہوگا۔ رہی وہ باتیں جن کے بارے ابھی اسے پوری طرح علم نہیں' معلومات ناقص ہیں' تجربات خام ہیں' مشاہدات پختگی کے مراحل طے نہیں کر پائے' عقل کو مکمل طور پر بروئے کار نہیں لا سکا تو اس کی انشاء اللہ کہنے کے پیچھے ایک غیر متزلزل عزم کارفرما ہوگا کہ میں اس شے کی بابت قوانینِ خداوندی کی پیہم اتباع کرتے ہوئے ایک دن ضرور ادراک حاصل کر کے رہوں گا۔ اس کی لم اور کنہ لازماً میری دسترس میں آ کر رہیں گی۔ ہاں اسباب کو بائی پاس کر کے ایک ایجنسی چیز کی حقیقت کو طرفۃ العین میں منکشف کر سکتی ہے اور وہ ہے وحی آسمانی لیکن ایک تو وہ خالص موہبت الٰہی ہے کسی اکتساب کو آزما کر اللہ سے رابطے استوار نہیں کئے جا سکتے۔ دوسرے

یہ کہ ختم نبوت کے بعد وحی تو کیا اس کے کسی مترادف نام سے بھی خدا اور بندے کے بیچ ''مکالمہ ومخاطبہ'' نہیں ہوسکتا اور ختمِ نبوت کا یہی قرآنی مفہوم ہے۔ ہاں خوش قسمتی سے مومنین+متقین کے لئے اللہ کی آخری وحی اپنی مکمل حالت میں آج بھی قرآن مجید کی صورت میں محفوظ ہے۔ گہرے تدبر اور پورے اخلاص کے ساتھ اگر اس مجموعے سے رشتہ قائم کر کے رہنما اصولوں کی روشنی میں کائناتی قوتوں کو اسیر اور تسخیر کرلیا جائے تو ہزاروں اسرار آج بھی بے نقاب ہونے کو تیار ہیں۔ اور یہ جذبۂ ارادہ انشاء اللہ کی ادائیگی میں چھپا ہوا ہے ورنہ تقدیر کے روایتی مفہوم کو مدنظر رکھ کر یہ کلمہ ادا کرنا ہے تو پھر اس کا مفہوم یہ ہوگا: کل انشاء اللہ مشرق سے سورج طلوع ہوگا'۔ کہ اگر اللہ نے چاہا تو مشرق سے آفتاب نمودار ہوگا اور اگر اللہ کا پروگرام بدل گیا تو ہوسکتا ہے وہ شمال یا جنوب سے ظاہر ہوجائے اب اللہ کی چاہت کو آزمانا کیا مشکل ہے' کوئی صاحب یہ کہہ کر دیکھ لیں کہ کل سورج مغرب سے انشاء اللہ طلوع ہوگا اور مشرق میں غروب ہوگا۔ وہ یہ ہزار بار کہہ لیں پر ہوگا کیا وہ مشرق سے ہی طلوع ہوگا اور مغرب میں ہی غروب ہوگا۔ اس لئے کہ خدا نے اپنی ''چاہت'' متعین کر دی ہوئی ہے یعنی اپنی مشیت غیر مبہم الفاظ وعمل میں واضح کر دی ہوئی ہے۔ لہٰذا جن قوانین خداوندی کا انسان شعور حاصل کر چکا ہے ان کے متعلق اسے پورے بھروسے کے ساتھ انشاء اللہ کہنے دیں کہ میرے رب کے قانون مشیت کے مطابق یہی ہوگا اور لکھ لیں عزتوں والا رب اپنے اس بندے کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائے گا' اسے کبھی کفار (منکرینِ قوانینِ خداوندی) کے سامنے رسوا نہیں کرے گا۔ یہ بھی اس کی مشیت ہے' اٹل قانونِ مشیت۔

اب دونوں مفاہیم میں زمین آسمان کا تفاوت ہے اول الذکر معانی کی رو سے انسان کا مجبور محض ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کا سارا کیا دھرا چپ چاپ خدا کے کھاتے میں چلا جاتا ہے' یوں سزا جزا کا سارا عظیم الشان نظام آنِ واحد میں زمیں بوس ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نہ حساب کتاب' نہ میزان' نہ شہادت' نہ مقدمہ' نہ قیامت' نہ جنت' نہ جہنم۔ دنیا وآخرت معاذ اللہ بازیچۂ اطفال بن جاتی ہیں اور اس کے برعکس ساری ذمہ داری انسان کے کندھوں پر آتی ہے اور وہ اپنے اعمال کے سلسلہ میں اس دنیا میں اور اس دنیا کے بعد پوری سنجیدگی کے ساتھ جواب دہ نظر آتا ہے۔ ویسے اس میں اکیلے جاوید چوہدری کا کیا قصور ہے۔ عہد موجود میں کم از کم ساری پاکستانی قوم کا یہی مسئلہ ہے۔ ہر فرد اپنے حصے کے منفی اعمال کسی اور کے سر منڈھ کر اسے ذمہ دار قرار دینے میں عافیت کا محفوظ تر گوشہ تلاش کر چکا ہے اور دوسروں کے کارناموں کا سہرا اپنے سر باندھ کر ہر قسم کا کریڈٹ لینا اس کا محبوب مشغلہ بن چکا ہے۔ اس تناظر میں رہی سہی کسر ہمارے یہ دانشور پوری کر رہے ہیں کہ اے مسلمانو! ''خاموش خدا'' جو موجود ہے۔ انشاء اللہ کہو اور سب کچھ اس کے کھاتے میں ڈال کر صاف بچ نکلو اگر اس کی ضمانت چاہتے ہو کہ وہ غضب میں نہیں آئے گا تو آستانوں پر نذر نیاز اور چندے تحائف لے آؤ' بے فکر رہو وہ اپنی جبیں پر کوئی بل نہیں لائے گا۔ انشاء اللہ!

عبدالرب صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زندگی کا لنگر

انسانی زندگی کی مثال کشتی کی سی ہے۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں بطخ کی مانند سیدھی تیرے گی۔ پانی میں سکون نہ ہو تو ہوا کے جھونکے اور موجوں کے تھپیڑے جدھر چاہیں اسے لے جائیں گے۔ لنگر کے بغیر کشتی کو قرار نہیں۔

کچھ ایسی ہی کیفیت انسان کی ہے۔ اسے آزاد چھوڑ دو تو کوئی بتا نہیں سکتا کہ وہ کدھر جائے گا اور کہاں ٹھہرے گا۔ مکھی کی مانند نہ اس کی کوئی خاص سمت ہوگی نہ جائے قرار۔ کاغذ کے پرزے کی طرح ہوا کا ہر جھونکا اسے اڑائے پھرے گا۔

لیکن زندگی کی ہوا فضائے آسمانی کی بجائے سینوں میں چلتی ہے اور آندھی کی طرح دل و دماغ کو لپیٹ میں لئے انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ وہ خون پسینہ ایک کرتا رہتا ہے مگر بکھرے ہوئے دانوں کو سمیٹ نہیں سکتا۔ اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی ؕ (92:4) اس کی زندگی میں لنگر نہیں ہے۔ انسان کی دن رات کی ساتھن اور رہنما عقل ہے لیکن عقل کو انفرادی نفع کمانے اور اپنے فائدوں کی جستجو سے کب فرصت ہے۔ لنگر ڈھونڈے تو کون؟ جس نے جان دی تھی آخر اسی نے بتایا کہ انسانی زندگی کا لنگر ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ یعنی اللہ کے دیئے ہوئے ہمیشہ رہنے والے زندگی کے وہ بنیادی اصول جنہیں اس کے رسول محمد ﷺ نے قرآن کریم میں لکھوا کر امت کو سونپا اور جن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا ہے۔ قرآنی اصولوں میں سے ایک اصول ''انسان کا جائز حق اس کی محنت کا بدلہ ہے''۔ یہ اصول ہوا زندگی کے لنگر کی ایک شاخ۔ لنگر کی ایک اور شاخ ہے ''تکریمِ انسانیت'' وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (17:70) ہم نے ہر انسان کو واجب التکریم بنایا ہے یعنی تکریم میں انسانوں میں تمیز نہیں کی جاسکتی۔ ہر انسان' انسان ہونے کی حیثیت سے قابلِ عزت ہے۔ کالا ہو یا گورا۔ امیر ہو یا غریب۔ مٹی میں لت پت مزدور ہو یا صاف ستھرا پیشہ ور۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ہو یا قیمتی لباس میں۔ نحیف و نزار ہو یا تنومند۔ ہم مذہب ہو یا غیر مذہب والا' غرض ہاتھ' پیر' آنکھ' کان۔ ناک والا ہر انسان عزت کے سلوک کا مستحق ہے۔ سامنے آئے ہوئے ہر انسان کو سلام کرنا طبیعت پر بار ہو سکتا ہے لیکن یہ ہچکچاہٹ (جو بہر حال ہے تکریم کے خلاف) کوشش سے دور کی جاسکتی ہے۔ اور نہ ہوگی تو تکریم کے ساتھ دوسروں کو ذلیل سمجھنے کا جذبہ بھی دل میں جگہ پائے گا اور زندگی دوزخی ہو جائے گی۔ جس سے ہمارا کام ہوا اس کی عزت کی اور جس کا ہم سے کام ہوا اسے دھتکار دیا۔ خود بھی لرزا کئے اور دوسروں کو بھی ہراساں کیا۔ تکریم' انسان کو باہمت اور حوصلہ مند بناتی ہے۔ کرنے والے کو بھی اور عزت پانے والے کو بھی۔ ہمت اور حوصلہ وہ چیز ہے جو جیتے جی انسان کو بلند رکھتی ہے اور جو موت کے بعد اس کی ذات کو زندگی کے اگلے مرحلے طے کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔ یعنی جنتی زندگی کا وارث۔ تکریم سے دنیا کی زندگی بھی جنتی بن سکتی ہے بہ شرطیکہ تکریم کو انسانی برادری کی تعمیر کی بنیاد بنایا جائے۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (2:201) مگر یہ حسین آرزو پیدائشی مسلمان کے منہ سے اسی وقت بھلی لگے گی جب وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا عہد پکا کرے۔ اور اٹھتے بیٹھتے۔ چلتے پھرتے ہر وقت اس کا

دھیان رکھے۔ یعنی اپنے ہر فیصلہ اور ہر کام میں پہلے یہ دیکھے کہ وہ قرآن کریم کی کسی ہدایت سے تو نہیں ٹکراتا۔ قرآن کریم نے اس عہد کو اللہ کا عہد کہا ہے اور اسے پورا کرنے کی ہدایت کی ہے وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ط (6:153) اس عہد کو توڑنے والے فاسق اور ٹوٹا (نقصان) پانے والے ہیں (2:27) پیدائشی مسلمانوں کی موجودہ پستی وہ نقصان ہے جو عہد اللہ کے توڑنے کی پاداش میں ان کے حصہ میں آیا ہے۔ تکریم کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ عزت کے سلوک کے ساتھ ساتھ تکریم کرنے والا واضح طور پر یہ بھی سمجھے کہ جس طرح وہ اپنی مرضی آزادانہ استعمال کرنا چاہتا ہے اسی طرح وہ دوسروں کو بھی اپنی مرضی آزادانہ استعمال کرنے سے نہ روکے اور اپنی مرضی کو ان پر ہرگز نہ ٹھونسے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مرضی جس کسی کی بھی ہو وہ قرآنِ کریم کی مقرر کردہ حدوں سے نہ بڑھے۔ تکریم کے سلسلے میں اتنی بات اور یاد رکھنی چاہئے کہ انسان کی بنیاد ہی تکریم کے بعد معاشرہ میں مختلف افراد کی عزت، ان کے اعمال اور کردار کی رو سے متعین ہوگی اور سب سے زیادہ عزت کا مستحق وہ ہوگا جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کا پابند ہوگا۔

پاکستان میں غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ

کا درس قرآنِ کریم مندرجہ ذیل مقامات پر بذریعہ ویڈیو ٹیپ ہوتا ہے

نوٹ: نمائندگان محترم سے التماس ہے کہ ایڈریس، فون نمبر، ای میل یا اوقاتِ درس میں تبدیلی کی صورت میں ادارہ کو فی الفور مطلع فرمائیں۔

شہر	مقام	دن	وقت
ایبٹ آباد	حجرہ احمد نواز خان، گاؤں گماوان، ایبٹ آباد۔ موبائل نمبر: 0342-9070193	بروز جمعہ	3:30PM
پشین، بلوچستان	عبدالسلام خان۔ موبائل نمبر: 0300-2638867	بروز اتوار	11AM
پنج کسی، خانیوال	بمقام مطب حکیم اینڈ سنز، پنج کسی، تحصیل کبیر والا، ضلع خانیوال رابطہ: ڈاکٹر محمد سلیم قمر، موبائل نمبر: 0301-6526518	ہر ماہ کے آخری اتوار	2PM
سرگودھا	مکان نمبر: 4بی، سٹریٹ نمبر: 7، بلاک نمبر: 21، سرگودھا موبائل نمبر: 0306-6730342	بروز جمعہ	3PM
فیصل آباد	دفتر ادارہ طلوعِ اسلام، فسٹ فلور رحمان نور سنٹر، مین بازار ڈگلس پورہ فیصل آباد برائے رابطہ: شیخ عقیل حیدر ایڈووکیٹ، موبائل نمبر: 0321-7645065	بروز جمعہ	4PM
DHA، کراچی	48 سی، 21 کمرشل اسٹریٹ، میز انین فلور، فیز 2، ایکسٹینشن ڈی ایچ اے، کراچی برائے رابطہ: محمد عامر، موبائل نمبر: 0333-1414004	بروز اتوار	10:30AM
ملیر سٹی، کراچی	سہیل اصغر بھٹی، موبائل نمبر: 0333-2295277	بروز اتوار	11AM
لاہور	25بی، گلبرگ 2، (نزد مین مارکیٹ، مسجد روڈ) لاہور۔ برائے رابطہ: آصف جلیل، موبائل نمبر: 0318-2221851	بروز اتوار	10:30AM
مینگورہ، سوات	بمقام فسٹ فلور، روم نمبر: 26، سلطان ٹاور نزد گراسی گراؤنڈ، مینگورہ، سوات برائے رابطہ: ارشد علی ایڈووکیٹ، موبائل نمبر: 0345-8567600	ہر ماہ پہلا جمعہ	2PM
فتح پور، سوات	حجرہ خورشید انور، گاؤں فتح پور، سوات، رابطہ: عمران خان، موبائل نمبر: 0342-2640195	بروز اتوار	10AM

علامہ عنایت اللہ اثری

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مسجدِ اقصیٰ

سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ① (17:1)

اس کا عام ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کو لے گئی۔

اس آیت میں مسجدِ اقصیٰ سے مراد بیت المقدس لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق واقعہ معراج سے ہے۔ جب حضور ﷺ پہلے مکہ سے بیت المقدس تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے آسمانوں کی سیر فرمائی۔

علامہ پرویز علیہ الرحمۃ نے مفہوم القرآن میں لکھا کہ یہ درحقیقت واقعہ ہجرت کا بیان ہے اور اس میں مسجدِ اقصیٰ سے مراد مدینہ طیبہ ہے۔ قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس پر (حسب عادت) شور مچادیا گیا اور اس کے خلاف دلیل یہ دی گئی کہ یہ بالکل نئی بات ہے۔ اس سے پہلے کسی نے ایسا نہیں کہا۔

جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے متقدمین میں سے (غالباً) کسی نے ایسا نہیں کہا تھا۔ لیکن یہ دلیل ہی بے معنی ہے۔ صحیح بات صحیح ہے خواہ وہ پہلی مرتبہ ہی کیوں نہ کہی گئی ہو اور غلط بات غلط ہے۔ خواہ اسے ہزار بار کیوں نہ دہرایا گیا ہو (اس کے بعد ''شاہکار رسالت'' میں موجودہ مسجدِ اقصیٰ کی تاریخ بھی بیان کردی گئی تھی)۔

اگلے دنوں ایک صاحب کی وساطت سے مولانا عنایت اللہ اثری (وزیرآبادی۔ ثم گجراتی) کی کتاب 'حصولِ تیسیر البیان (علیٰ) اصولِ تفسیر القرآن' دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ دیکھ کر (حیرت اور) خوشی ہوئی کہ اس میں انہوں نے اس آیت میں مسجد اقصیٰ کا وہی مفہوم لیا ہے جسے مفہوم القرآن میں لکھا گیا تھا اور اس سلسلہ میں انہوں نے بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ مولانا صاحب فرقہ اہل حدیث کے ایک ممتاز عالم تھے۔ ایک اہل حدیث عالم کی طرف سے اس آیت کا وہ مفہوم جو روایاتی مفہوم سے ہٹا ہوا ہو، واقعی باعثِ تعجب اور اس لئے وجہِ حیرت ہے۔ ان کی تحقیق کے ضروری مقامات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

حصول تیسیر البیان (علیٰ) اصول تفسیر القرآن

(از مولانا عنایت اللہ اثری، وزیر آبادی، گجرات، شائع کردہ اپریل 1955ء)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی۔۔۔عَبۡدًا شَکُوۡرًا ۳

(17:1 تا 3)

اللہ رحمن ورحیم کا نام لے کر پڑھو۔ چرچا کرو (اور) وعدہ خلافیوں اور غلط پیشگوئیوں سے اسے خوب پاک اور صاف بیان کرو تا کہ وہ اپنے بندے (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو مسجد حرام سے (جو کہ اس کی جائے سکونت ہے) اس مسجد کی طرف کسی نہ کسی رات روانہ کر دے گا جو کہ یہاں سے بہت دور ہے اور کہ تبلیغ و اشاعت کی وجہ سے اس کے اردگرد بہت سے سعید الفطرت لوگ مسلمان ہو کر اسلامی انوار و برکات سے متمتع ہو رہے ہیں اور حلقۂ اسلام دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے اور اس لئے اسے یہاں سے روانہ کیا جا رہا ہے کہ اس کے توسط سے اب تک ہماری وہ آئتیں جو کہ پیش گوئیوں سے متعلق شائع ہوتی رہی ہیں کہ وہ اور اس کے اعوان و انصار کامیاب اور اس کے مخالف سب ناکام ہوں گے۔ ہم انہیں صاف طور پر پورا کر کے دکھا دیں اور مخالفوں کی طرف سے جو یہ اعتراض ہوتا رہا ہے کہ فلاں فلاں پیشگوئی پوری نہیں ہوئی۔ اسے اللہ پاک سنتا رہا ہے اور جو کسی پیشگوئی کے خلاف انہوں نے قدم اٹھایا تا کہ وہ پوری نہ ہو سکے۔ اسے اللہ دیکھتا رہا۔ اب ان کے پورا ہونے کا وقت آیا ہے تو اسے یہاں سے کسی دوسری جگہ روانہ کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح پر موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے توسط سے بھی ہم نے فرعونی ناکامی اور موسوی کامیابی کی بابت بھی بہت سی پیشگوئیاں شائع فرمائیں جن کا ذکر اسی سورۃ میں آئندہ چل کر آ رہا ہے۔ جب ان کے پورا ہونے کا وقت آیا تو اسے مصر چھوڑ کر دوسری جگہ جانا پڑا جہاں پر اسرائیلیوں کو ہماری دی ہوئی کتاب پر آزادانہ طور پر عمل کا موقعہ ہاتھ آیا کہ وہ اللہ پاک کے سوا کسی دوسرے کی طرف مائل نہ ہوں۔ قبل ازیں اسی طرح پر نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشگوئیاں بھی کہ وہ اور اس کے اعوان و انصار کامیاب اور دشمن سب ناکام ہوں گے پوری ہوئیں کہ انہیں کشتی میں بٹھا کر بچایا اور دوسروں کو غرق کر دیا۔ پھر بعد میں بچے ہوئے لوگوں کا سلسلہ نسل چلا کر آج ہم تمہیں اس بندۂ شکر گزار کی سنت پر دعوت دے کر شکر گزاری کے لئے خطاب کر رہے ہیں (صفحہ 111-113) ابتدائی آیت کریمہ پر کتب تفاسیر میں عموماً اس کے اسراء نبوی کو بیان کیا گیا ہے جس کا موضوع اور صحیح حدیثوں میں بتصریح ذکر ہے اور بعض ائمہ صحاح نے بھی اس آیت کریمہ کو عنوان بنا کر ان حدیثوں کو بیان فرمایا ہے مگر متونِ حدیث میں آیت کریمہ کا کوئی ذکر نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا اسراء بیان فرماتے ہوئے اس آیت کریمہ کا ذکر فرمایا اور کسی روایت میں اس آیت کریمہ کا وہ شان نزول بھی مروی نہیں جس کا اسراء کی حدیثوں میں ذکر ہے اور جو کتب زرائد میں قتادہ اور زر بن حبیش سے مقطوعاً اور عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ اور ابوہریرہؓ سے موقوفاً اور ابوسعید خدریؓ اور ابوہریرہؓ سے مرفوعاً اسی آیت کریمہ کا ذکر مروی ہے تو وہ محدثانہ طریق پر سخت مخدوش ہونے پر بھی مستر د نہیں کہ وہ قرآنی لفظوں کے اطلاق اور تناسب پر محمول ہے۔ علاوہ اس کے اسراء کی جن حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہاب جانے کا ذکر ہے ان میں آپ کے ایاب آنے کی بھی تصریح ہے مگر آیت کریمہ میں جس اسراء کا ذکر ہے اس میں واپسی کا کوئی ذکر کیا اشارہ تک بھی نہیں (صفحہ:114)۔‘‘

(سورۃ الانفال میں جو عدوۃ الدنیا اور عدوۃ القصویٰ کا ذکر آیا ہے اس پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ) بدائکہ سے قصویٰ ہوا اور جب یہ قصویٰ ہے تو مدینہ بالا والی قصویٰ ٹھہرا اور اس کی مسجد (نبوی) اقصیٰ ہوئی۔ بلکہ وفاء الوفا جلد نمبر 1 صفحہ 16 میں مطالع وغیرہ کا حوالہ دے کر بیان کیا گیا ہے کہ مدینہ طیبہ کے ناموں میں سے ایک نام اس کا مسجد اقصیٰ بھی ہے (ص 121)۔ صحیح بخاری پارہ 15 صفحہ 476) میں ہے کہ مسجد نبوی جس جگہ تعمیر ہوئی اس جگہ پر آپ کی تشریف آوری سے پہلے مسلمان اس میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ اور فتح الباری پارہ 15 صفحہ 477) میں ابن سعد سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مسجد نبوی کی جگہ پر اسعد نماز پڑھایا کرتے تھے اور وفاء الوفاء (جلد 1 صفحہ 232) میں بحوالہ ابن اسحٰق منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مسجد نبوی کی جگہ میں اسعد بن زرارہ پنج وقتہ نماز پڑھتے اور پڑھایا کرتے تھے بلکہ جمعہ بھی وہی پڑھایا کرتے تھے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ بھی وہاں پر ہی نماز پڑھتے پڑھاتے رہے۔ پھر اس کے بعد اسعد کی کوششوں سے آپ نے وہاں پر مسجد تعمیر فرمائی جو کہ آج تک مسجد نبوی کے نام سے موسوم ہے۔ اور جہاں پر مسجد قبا تعمیر ہوئی وہاں پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے پنج وقتہ نماز بلکہ جمعہ بھی پڑھا پڑھایا جاتا تھا اور امام سالمؓ تھے اور خطیب مصعب تھے..... فتح الباری (پارہ 15 صفحہ 476) میں بحوالہ ابن ابی شیبہ جابرؓ سے مروی ہے کہ مدینہ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے جہاں جہاں پر تبلیغ و اشاعت سے اسلام پھیلا اور لوگ مسلمان ہوئے وہاں پر مسجد بنا کر نماز شروع کر دی گئی۔ (صفحہ 24-122)۔

اس کے بعد محترم مصنف نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں جو آیا ہے وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ تو اس میں المسجد سے کیا مراد ہے۔ انہوں نے بدلائل و براہین واضح کیا ہے کہ اس سے مراد وہ مسجد اقصیٰ نہیں جس کا ذکر آیت اسریٰ میں آیا ہے۔ جس مسجد کا ذکر آیتہ اسریٰ میں آیا ہے اس سے مراد مدینہ طیبہ ہی ہے۔ بیت المقدس والی مسجد کا نام مسجد اقصیٰ بعد میں رکھا گیا تھا۔ (صفحہ 244-125)

☆☆☆

مولانا مرحوم نے اپنے مقالہ میں ''اسریٰ'' کا ترجمہ ''لے گیا'' کے بجائے ''لے جائے گا'' (روانہ کر دے گا) کیا ہے۔ یعنی ماضی کے بجائے مستقبل۔ اس کی تائید میں بھی انہوں نے دلائل دیئے ہیں۔ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے۔

☆☆☆

❶ (حاشیہ از مصنف) یہ عجیب بات ہے کہ جس اونٹنی پر سوار ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر ہجرت طے فرمایا وہ مدینہ طیبہ پہنچ کر مسجد نبوی کی جگہ میں بحکم خداوندی بیٹھ گئی اور اس کا نام قصویٰ (قصواء) قرار پایا (زاد المعاد۔ عمدۃ الغاری۔ وفاء الوفاء)۔ اسی قصویٰ پر حضور ﷺ نے تمام بڑے بڑے اہم سفر طے فرمائے۔

❶ ان مقامات پر اردو ترجمہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ عربی عبارات حذف کر دی گئی ہیں۔ (طلوع اسلام)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد عمر صاحب (وائس چیئرمین وسابق نمائندہ بزم لاہور)
کی وفات پر تعزیتی پیغامات

آہ ایک اور ہم سفر نے بھی راستے الگ کر دیئے۔ کچھ دیر پہلے خالد فاروقی صاحب نے فون پر محترم محمد عمر صاحب کی وفات کی المناک خبر سنائی۔ محترم محمد عمر صاحب ایک خوش اخلاق، خوش گفتار اور متوازن شخصیت کے مالک تھے۔ موقع کی مناسبت سے مزاح کے انداز میں مثال کے ذریعے بات سمجھانے، باتوں میں مٹھاس پیدا کرنے اور سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا فن خوب جانتے تھے۔ تحریک کے ہر پروگرام میں سٹیج سیکرٹری کے فرائض وہ ایک منفرد انداز سے سرانجام دیتے تھے۔ موجودہ کنونشن میں ان کی بھرپور شرکت ان کی تحریک کے ساتھ بے انتہا محبت کی مثال ہے کیونکہ انہوں نے انتہائی کمزوری اور بیماری کے باوجود قوت عشق کے سہارے ناممکن کو ممکن بنا کر دکھایا۔ ان کی اچانک جدائی طلوع اسلام کے ہر رکن کیلئے ایک عظیم سانحہ ہے اور تحریک کیلئے ایک ناقابل تلافی نقصان۔ ان کی خدمات کو حلقہ طلوع اسلام میں ہمیشہ کے لیے یاد رکھا جائے گا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم ومغفور کو اپنے سحاب کرم ومراتب عالیہ سے نوازیں۔ اور ان کے اقرباء ولواحقین کو اس عظیم سانحہ کی برداشت کرنے کا حوصلہ عطاء فرمائے آمین۔ یارب العالمین!

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

غمگسار

خورشید انور (چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام)

Very sad to hear the news about umer Saheb's death. He was a dedicated person and was with us from as long as I can remember. May Allah grant him a high place in Jannah.

Ubed-ur-Rehman Arain (Executive Head Tolu-e-Islam Trust)

Salaam all members. Just read all these messages and profoundly realised the depth of the loss of Umer bhai. We will definitely miss his absence. His dedication and motivation for the cause of Tolu e Islam was immeasurable ... always available on the other side of the phone. I can recount many long conversations with him which were always focused on some aspect of our striving on this path. His memory and thought of his services will stay

with us i.e. among the family of Tolu e Islam as long as we are alive in this finite life. Hopefully his family will overcome his absence by finding solace in his work on the path of the Quran... those members who will attend his funeral, please convey our heartfelt tributes to them about Umer bhai... he is gone to a better place to experience a new life for which he worked with all of us as a team with united hearts. We will continue our strivings as long as we live on this path of Deen which we have deliberately chosen for our selfs.
kind regards. Dr. Ejaz Rasool (Vice Chairman Idara)

بزم طلوع اسلام لاہور کے زیر اہتمام درس قرآن کے بعد محترم محمد عمر رحمۃ اللہ کی یاد میں ایک تقریب کا انعقاد ہوا جس میں بزم خواتین نے بھی شرکت۔ اس میں محترم سلیم اختر صاحب نے محترم چیئرمین صاحب کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ اس میں اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر شاہد نسیم، محمد عاقب، خالد فاروقی، خالد عبداللہ، شیخ پرویز انور، اور پروفیسر ڈاکٹر صالحہ لغمی نے ان کی ذاتی، علمی اور انداز گفتگو کی خوبیاں بیان کیں اور ان کی رحلت کو ناقابل تلافی نقصان قرار دیا۔ آخر میں محمد عمر مرحوم کے فرزند ارجمند محمد یونس نے بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

آصف جلیل (نمائندہ بزم لاہور)

اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت فرمائے۔ ان کی خدمات تادیر یاد رکھی جائیں گی۔ خاص طور ہر کنونشن میں ان کا مرکزی کردار رہا ہے۔ طلوع اسلام کے احباب کو مرحوم عمر صاحب کی غیر موجودگی کا شدت سے احساس ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔

محمد اقبال (سابق نمائندہ بزم ڈی ایچ اے کراچی)

فکر قرآنی سے وابسطہ حلقوں میں یہ خبر انتہائی دکھ اور ملال کے ساتھ سُنی گئی ہے کہ بزم طلوعِ اسلام لاہور کے دیرینہ رفیق اور ادارہ طلوع اسلام کے وائس چیئرمین میاں محمد عمر ایک مختصر عرصہ کی علالت کے بعد اس جہان فانی سے رُخصت ہو گئے۔

میاں عمر ایک دلکش اور مضبوط اعصاب کے مالک توانا انسان تھے۔

زندگی بھر ایک حلیم الطبع ہنس مکھ انسان دوست اور دوسروں کے بگڑے ہوئے معاملات کو سنوانے والی شخصیت کے طور پر جانے جاتے، خاندان بھر میں انہیں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔

قرآنِ کریم انسان کی جس قسم کی سیرت سازی کرنا چاھتا ہے وہ ان قرآنی اقدار کا ایک دل آویز پیکر تھے۔

دُکھی انسانیت کے لیے ایک غمگسار ساتھی کی حیثیت سے وہ مدتوں یاد رکھے جائیں گے قرآنی فکر کی ترویج وتوسیع کے لیے ان کی خدمات کا عرصہ پچاس سال سے زائد پر محیط ہے۔

مصلحت کوشیوں کے احساس سے آزاد وہ قرآنی روشنی کو عام کرنے کے لیے دیوانہ وار مصروف جدوجہد رہے ان کی وفات سے بزم طلوع اسلام لاہور اور خصوصاً ادارہ طلوع اسلام کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے بزم ٹورانٹو محترم میاں محمد عمر صاحب کے پسماندگان کی خدمت میں دلی پیغام تعزیت پیش کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں۔ آمین

رفعت علی خان (نمائندہ بزم ٹورانٹو کینیڈا)

آہ! ایک اور شمع قرآنی بجھ گئی۔۔۔ محترم عمر صاحب کی خبر پڑھ کر ایک دم دل کو جھٹکا سا لگا کنونشن کے موقعہ پر تو مرحوم بظاہر صحت مند لگ رہے تھے لیکن اللہ کا قانون تو اٹل ہے۔ وہ کسی وقت لاگو ہوسکتا ہے۔ مرحوم بہت ملنسار، نرم گو، خوش اخلاق، انکی میٹھی میٹھی پر مغز باتیں ہمیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔

ان کی رحلت تحریک کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ان کی ول پاور بہت مضبوط تھی۔ اللہ پاک ان کی اگلی منزلیں آسان فرمائے پسماندگان کو ہمت حوصلہ اور صبر جمیل کی توفیق فرمائے تمام احباب بزم لاہور کے اس صدمہ میں اور میری بزم پنچ کسی برابر کی شریک ہے۔

ڈاکٹر سلیم قمر (نمائندہ بزم پنچ کسی)

محترم محمد عمر صاحب کے نام سے شناسائی تو ایک طویل عرصے سے تھی اور گذشتہ کنونشن کے دوران ملاقات کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ عمر صاحب ایک نہایت منکسر المزاج اور زندہ دل انسان تھے۔ مرحوم کی تحریک طلوعِ اسلام کے لیے خدمات کبھی فراموش نہیں کی جاسکیں گی۔ خدا انہیں اگلے سفرِ حیات میں مزید بلندیاں عطا فرمائے۔ آمین

محترم احبابِ گرامی، آج مورخہ 24 نومبر 2024، بعد از درس، بزم طلوعِ اسلام، ڈی ایچ اے کراچی میں وائس چیئرمین مرحوم محمد عمر صاحب کی یاد میں ایک تعزیتی قرارداد پیش کی گئی۔ اراکینِ بزم نے محترم محمد عمر صاحب کی تحریک کے ساتھ طویل وابستگی اور مرحوم کی خدمات کو سراہا اور اگلی منزلِ حیات میں ان کے درجات کی بلندیوں کے لیے دعا کی۔ بزم محترم محمد عمر صاحب کی فیملی کے دکھ میں برابر کی شریک ہے اور ہم دعا گو ہیں کہ خدا انہیں اس صدمے کو برداشت کرنے کی ہمت اور حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین

محمد عامر (نمائندہ بزم ڈی ایچ اے کراچی)

ہم جناب محمد عمر صاحب کے انتقال پر دلی تعزیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے اور ان کے اہل خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ محمد عمر صاحب کی زندگی قرآنِ مجید کے پیغام کو عام کرنے اور

طلوعِ اسلام کی خدمت میں گزری، جس پر ہم انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ ان کا کام رہتی دنیا تک ایک مشعلِ راہ رہے گا۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے اہل خانہ کو اس صدمے کو برداشت کرنے کا حوصلہ اور استقامت عطا کرے۔ آمین۔

عمران خان (نمائندہ بزم فتح پور، سوات)

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ (2:156)

اللہ تعالیٰ ان کی اگلی منزلیں آسان فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ لواحقین کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر عروج نعیم (نمائندہ بزم خواتین سوات)

ادارہ طلوع اسلام ایک انتہائی مخلص، ملنسار اور باصلاحیت انسان سے محروم ہوگیا، ادارے کے لیے ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی، دعا ہے کہ ان کی اگلے ارتقائی منازل آسان اور خوشگوار ہوں۔ آمین

عبدالسلام (نمائندہ بزم پشین، بلوچستان)

اچھے لوگوں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ انہیں یاد رکھنا نہیں پڑتا وہ یاد ہی رہتے ہیں۔ محمد بھی اور عمر بھی والدین نے کیا سوچ کر اتنا خوبصورت نام رکھا تھا۔ ان کی شخصیت کے عین مطابق تھا۔ آج ان کے نام کے ساتھ محروم کہتے ہوئے انتہائی دکھ اور تکلیف کا احساس شدت سے محسوس ہو رہا ہے۔ یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ آج وہ ہم میں شامل نہیں ہمارا ساتھ چھوڑ کر حیاتِ ابدی کی طرف چلے گئے جہاں ایک دن ہم سب نے بھی جانا ہے۔ اور یہی نظامِ قدرت ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ط (3:185)

سن 2000ء میں علامہ پرویز صاحب کے درس میں ان سے میری ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر فریدالدین احمد اور محمد عمر دونوں پرانے دوست تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ ہم بھی اس دوستی کے رشتہ میں شامل ہوگئے۔ دونوں خوش مزاج تھے۔ سب کے ساتھ کھلے دل اور خوش اخلاقی سے پیش آتے۔ نمائندہ بزم طلوعِ اسلام لاہور کی ذمہ داری بڑے احسن طریقے سے نبھائی اور وائس چیئرمین کی حیثیت میں ہم سے رخصت ہوئے۔ کنونشن میں سٹیج سیکرٹری کے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے، ان کے بروقت شگوفے اور شگفتہ مثالیں ہمیں یاد رہیں گی۔ اور ان کی کمی ہمیشہ رہے گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ محمد عمر صاحب کے درجات بلند کرے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ ملے آمین۔

شیخ پرویز انور (ممبر بزمِ لاہور)

نفیسہ فریاد چاہل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اقبال کا شاہین ہو کہ پرویز کا سلیم

ہمارا آج کا مضمون علامہ غلام احمد پرویز صاحب کے دیئے گئے ایک انٹرویو سے لیے گئے الفاظ کا مجموعہ ہے علامہ اقبال کی پیش کردہ تعلیمات قارئین کی نذر کی جائیں گی۔ آج کی ضرورت بھی یہی ہے۔ امت کو بہرحال اکٹھا ہونے کی ضرورت ہے۔ دنیا میں جس طرح جنگ وجدل کا ماحول ہے اور اس کے لیے مسلمانوں اور مظلوموں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ اس کو بیاں کرنے کو کچھ اور سفیروں کی ضرورت امت کو ہے۔ جو اپنے زمانے میں مسلمانوں کی حالتِ زار پر شاید خون کے آنسو روئے تھے۔ جو کہ اس قدر معنی خیز تھا کہ آج بھی کوئی دردِ دل والا انسان سن لے تو شاید رو دے۔ یہ پرویز صاحب کے الفاظ ہیں اور انہی کی زبانی اس میں موقع محل کی مناسبت سے اقبال کی شاعری شامل کی گئی ہے۔ آج اس میں ہم نہیں بولیں گے۔ کیونکہ بزرگوں کی باتیں بہت بڑی حقیقت ہیں۔

پرویز صاحب اپنے ایک انٹرویو میں بیان کرتے ہیں:

قرآن کی تعلیم تو ہے کہ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213)۔ وہ تمام نوعِ انسانی کو عالمگیر برادری بنانا چاہتا ہے۔ جو رنگ، نسل، جغرافیائی حدود اور Teritorial بیسز ان تمام سے ماوراو بلند ہو کر خالص ایمان کے اشتراک پر ایک امت بنتی ہے۔ یہ جوامتِ واحدہ کا تصور تھا مسلمانوں کا۔ یاد رکھیے مسلمان اسی طرح تھے۔ جس طرح آج ہیں قومیت کے اوپر بٹے ہوئے تھے۔ جغرافیائی اور ٹیری ٹوریل کے اندر گھری ہوئی نسل کے اعتبار سے بھی یہ قومیں تھیں۔ رنگ وخون کے اعتبار سے بھی قومیں تھیں، جغرافیائی اعتبار سے بھی یہ قومیں تھیں۔ یہ ساری الگ الگ قومیں تھیں۔ اقبال کی پہلی آواز یہ تھی کہ یہ جو نقشے پہ تم لوگوں نے لکیریں کھینچ کر اپنے لیے ٹیوٹوریل بنالی ہیں۔ یہ بالکل منشاءِ خداوندی کے خلاف ہے۔ اس نے کرۂ ارض پہ کوئی لائن نہیں کھینچی۔ رنگ ونسل کی بنیاد جو ہے یہ صرف بائیولوجیکل ہے۔ اس کا کوئی تعلق معاشرے کی اجتماعیت سے نہیں ہے۔ یہی چیز تھی جس کا اقبال نے اس زمانے میں تصور دیا۔ یہ بات 1940ع کی نہیں ہے کہ اس نے دوقومی نظریہ دیا ہے۔ اقبال نے اس دور میں یہ تصور دیا مسلمانوں کو۔ میرا موضوع دوسرا تھا کہ اقبال یہاں سے گیا تھا تو گاتا ہوا گیا تھا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا لیکن جب واپس آتا ہے تو اس نے پیغام یہ دیا کہ نہیں ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' یہ جو مسلم کا وطن سارا جہاں ہے۔ لوگوں نے کبھی غور نہیں کیا کہ یوں تو یہ بچوں کا ترانہ ہے لیکن یہ کتنی فلسفیانہ بات کہہ جاتا ہے۔ سارا

جہاں وطن ہے ہمارا'' کیوں؟'' مسلم ہیں ہم اس دور میں اس نے یہ بات کہی آ کر صاحب! اس دور اس دور کے اندر اس نے کہا کہ اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے۔ اسلام دین کی وجہ سے ''اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے۔'' اس نے الگ الگ دیس جو تھے ان پہ خطِ تنسیخ کر دیا۔ اس نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک قوم کے قالب میں ڈھالنے کا پیغام دیا اور پھر اتنی وضاحت سے چیزیں کہتا چلا گیا کہ، یہ ہندی وہ خراسانی وہ تورانی تُو ہے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا اور غبار آلودۂ رنگ نسب ہیں بال و پر تیرے تُو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا اور پھر ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر۔ سوچیے یہ کیا کچھ کہہ رہا ہے اقبال، اور جو کرے گا امتیاز رنگ وخوں، مٹ جائے گا۔

یہ وہ چیز ہے جو قرآنِ کریم نے کہی، یہ وہ چیز ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمائی تھی کہ ''رنگ اور خون کی تمام نسبتیں اور تمام تضادات اور تمام فرق آج میرے پاؤں کے نیچے کچلے ہوئے ہیں۔'' یہی چیز تھی انہوں صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اپنے خطبہ حجۃ الوداع کے اندر فرمائی تھی کہ یہ تمام تضادات اور تفرقات میرے پاؤں تلے روندے ہوئے ہیں۔ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور تمام ابنِ آدم ایک ہی باپ کی اولاد ہیں اور ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد جو قرآن کریم کی تشریح تھا۔ ''كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً'' یہ بھولے ہوئے تھے ہم۔ مسلمان بھی باقی قوموں کی طرح قوموں کے اندر بٹے ہوئے تھے، وطنوں کے اندر بٹے ہوئے تھے، نسلوں کے اندر بٹے ہوئے تھے۔ اقبال کے احسانات کا تو پتہ نہیں ہے مسلمانوں کو۔ کسی نے یہ پیش ہی نہیں کیا اس کے سامنے کہ اس کے کتنے بڑے احسان ہیں۔ اس نے یہ پیغام دیا تھا عزیزانِ من! کہ ایک ''ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے'' یہ جو چیز اقبال نے اس دور کے اندر کہی اسے میں سمجھتا ہوں کم از کم غیر شعوری طور پر پنجاب کے مسلمانوں کا اس دور کے اندر کہہ سکتا ہوں کہ ان کے اندر تو یہ چیز تھی۔ اقبال کی یہ تعلیمات، ان کی زبان پہ تھیں اور اسی سے یہ صورت تھی کہ اگر افریقہ کے صحرا میں کسی حبشی کے پاؤں میں کانٹا چبھتا تھا تو ان کی آنکھ کے آبگینے میں آنسو چھلک آیا کرتا تھا۔ تڑپ اٹھتا تھا یہاں کا مسلمان۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی مسلم ملک نے ان کے کسی غم میں کسی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن یہ معاوضہ نہیں چاہتے تھے۔ بڑے کشادہ دل تھے یہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کی تعلیم جو اس نے قرآن سے حاصل کی تھی (اس کا ثمرہ تھا) اندازہ لگائیے۔ طرابلس کی جنگ۔۔۔ بڑی مشہور جنگ ہے۔ یہاں جس طرح سے قیامت برپا ہوئی، میں خود تو موجود نہیں تھا بادشاہی مسجد میں، بادشاہی مسجد میں جلسہ ہوا تھا مشہور (جلسہ) اس جلسے میں اقبال نے اپنی وہ مشہور نظم پڑھی تھی ''حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں'' بڑی محاکاتی نظم ہے کہ مجھے فرشتے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں لے گئے جنت میں، وہاں گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو وہاں سے آیا ہے تو ہمارے لیے کیا تحفہ لایا ہے؟ انہوں نے کہا کہ صاحب! یہ امت نادم و شرمسار حضور کے لیے کیا تحفہ لائے گی؟ لیکن اس کے باوجود میں خالی ہاتھ نہیں آیا۔ پورا صحن بھرا ہوا تھا مسجد کا۔ اس میں یہ تقریر کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں حضور خالی ہاتھ نہیں آیا۔ مگر میں نذر کو ایک آبگینہ لایا ہوں جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی۔ وہ کیا چیز تھی؟

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں تیری امت کی آبرو۔ اس میں کیا ہے؟ ''طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں'' دیکھنے والے جو اس محفل میں موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ لوگوں نے ٹکریں ماریں صاحب! کچھ پتہ نہیں طرابلس کہاں ہے؟ وہ کون ہے جن کا یہ (ذکر ہے) مسلمان ہیں کہیں کے جن کے اوپر یہ ظلم ہوا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اقبال یہ پیغام دیتا جاتا ہے اور اسی جنگ میں ''فاطمہ بنتِ عبداللہ'' کے عنوان سے نظم موجود ہے۔ ایک بچی جو زخمیوں کو پانی پلاتے پلاتے خود شہید ہوگئی تھی۔ اس کے متعلق ہے یہ نظم۔ اس کے لیے بھی وہ یہ نہیں کہتا کہ تو طرابلس کے لوگوں یا وہاں کی قوم کے لیے باعثِ فخر ہے۔

فاطمہ تُو آبروئے امتِ مرحوم ہے۔ یہ چیزیں ہیں اقبال کے دیکھنے کی۔ ''تُو آبروئے امتِ مرحوم ہے'' اور پھر ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!

وہ اپنی خاکستر اسے کہتا ہے صاحب! یہ تھے وہ پیغامات جو اقبال عام کرتا جاتا تھا اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ پنجاب کے مسلمانوں کی میں شہادت دیتا ہوں۔ میرا مطالعہ یہیں تک تھا اور بعید از سپاس گزاری ہوگا اگر میں یہ عرض کروں کہ اس دور میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے بھی اس باب میں (لکھا)۔ الہلال کا اس دور کے ''الہلال'' (روزنامہ) کا آپ 13,12,11 کا دیکھیے۔ اس میں بھی ترکوں کے ساتھ بین المللی تعاون اس دور کا ترکوں کے ساتھ بالخصوص بڑی نمایاں حیثیت سے ادا کیا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو اس میں بھی ترک (ترکی) انگریزوں کے خلاف جرمنی کے ساتھ تھا۔ مولانا محمد علی مرحوم نے اپنے کامریڈ کے اندر choice of the Tass کے عنوان سے جو مقالہ لکھا۔ کہتے ہیں کہ تین دن تین راتیں کمرے میں بند رہا۔ جب اس نے لکھا ہے اور جب اس نے لکھا ہے تو ساری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔

بزمِ طلوعِ اسلام ٹورانٹو کے زیراہتمام

1980ء سے جاری

بزبانِ پرویز علیہ الرحمہ

درسِ قرآنِ حکیم

(بذریعہ پروجیکٹر)

ہر ماہ کے پہلے اتوار

ایٹوبیکوک اولمپئیم

Etobicoke Olympium

میں دن گیارہ بجے پیش کیا جاتا ہے

لانگ ویک اینڈ کی صورت میں درس

مہینہ کے دوسرے اتوار کو پیش کیا جاتا ہے

اربابِ فکر و نظر کیلئے شرکت کی دعوت ہے

416.626.6177 - 416.418.0418

Etobicoke Olympium: 590 Rathburn Rd. Etobicoke ON, M9C 3T3

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں' انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور سُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو' جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.78
ISSUE
01

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/idaratolueislam1/ www.youtube.com/idaratolueislam